**رفیق ڈوگر کے سفرنامے"اےآب رود گنگا "کا تجزیاتی مطالعہ**

تحقیقی مقالہ برائے بی-اے (آنرز)



**مقالہ نگار** **نگران مقالہ**

حلیمہ سعید ڈاکٹر فرزانہ ریاض

رول نمبر:BS-U-213615 شعبۂ اُردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور

**سیشن: 2025ء-2021**

**شعبۂ اُردو**

**جی سی یونیورسٹی، لاہور**

فہرست

عنوانات صفحہ نمبر

پیش لفظ 3

باب اول: اردو سفرنامے کی روایت 5

باب دوم: رفیق ڈوگر احوال و آثار 22

باب سوم: "اےآب رود گنگا "تجزیاتی مطالعہ 25

ا) کہانی 25

ب)فنی جائزہ 38

پ) فکری جائزہ 55

محاکمہ 64

کتابیات 66

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور راحت اللعاشقین صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر کھربوں گنا درود و سلام کے بعد عرض نویس ہوں کہ والدین کی دعاؤں اور روحانی و دنیاوی رہنمائی سے میں آج بی ایس( آنرز) اردو ڈگری کے تکمیلی مراحل میں داخل ہو چکی ہوں ۔ یونیورسٹی کے چار سالوں میں بھرپور علم حاصل کرنے اور سیکھنے کا موقع ملا ۔ اب یہ سفر اختتام کے قریب ہے ۔ ہر آئندہ دن منزل قریب کرتا جا رہا ہے ۔

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنا میری دلی خواہش تھی ۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ میرے گھر والوں کا خواب تھا تو بےجا نہ ہوگا۔ آج ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کے قریب ہے ۔

میرے مقالے کے عنوان سے ظاہر ہے یہ رفیق ڈوگر صاحب کے سفرنامہ " اے آب رود گنگا" کے تجزیہ پر مشتمل ہے ۔ یہ مقالہ میں نے اپنے نگران کی مشاورت سے منتخب کرکے اس پر کام کیا ہے ۔ میری نگران ڈاکٹر فرزانہ ریاض جنہوں نے اس سفر میں بھرپور نگرانی اور توجہ سے اپنے فرائض کی انجام دہی کی اور ہر موقع پر مشکل حل بھی کی ۔

رفیق ڈوگر کے لکھنے کے انداز سے میں ان کے اسلوب کی کئ لحاظ سے گرویدہ ہوگئ ہوں ۔ ان کے اسلوب میں تاریخی شعور ، قومی شعور ، رومانویت ، طنز اور واقعات کی حقیقی و زمینی تعبیر ان کو دیگر لکھنے والوں سے قدرے ممتاز کردیت ہے ۔

بنیادی طور پر کتاب 26 ابواب پر مشتمل ہے ۔ جس میں لاہور سے امرتسر ، امرتسر سے دہلی اور دہلی سے آگرہ تاج محل کے دیدار تک کے تاثرات و مشاہدات شامل ہیں ۔

مقالے کے آغاز سے اختتام تک کے سفر میں جن اساتذہ ، عزیز و اقارب نے میری مدد اور تعاون کیا ہے اور اس سفر کو میرے لیے آسان بنایا ہے میں ان کی تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ اس علمی سفر میں عیشیٰ اور طیّبہ نے میرا سب سے زیادہ ساتھ دیا اور وقت کی پرواہ کیے بغیر بھرپور مدد و حوصلہ افزائی کی ۔ ان کی بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں ۔

آخر میں اپنی نگران کی مکرر شکرگزار ہوں جو ہر وقت میرے لیے میسر اور مشکل پڑنے پر ہمہ تن گوش رہیں اور جہاں مجھے مشکل پیش آئی اسے حل کروایا ۔

حلیمہ سعید

طالب علم

بی۔اے ( آنرز)

باب اول:

اردو سفرنامے کی روایت

قدیم دور میں تجارت، حصولِ علم اور جنگ وجدل کے سلسلے میں اقوام سفر اختیار کرتی تھیں بہت کم لوگ سیاحت کی غرض سے بھی سفر کرتے تھے لیکن اب تک دستیاب سفرناموں میں " میگستھنیز " کا سفرنامہ سب سے قدیم شمار ہوتا هے جو تین سو قبل مسيح یونان میں تحریر کیا گیا تھا1 ۔

943ء میں ابو عبدالله مقدسی کا اسلامی ممالک کا سفرنامہ جو کہ مسلم سفرنامہ نگار کی حیثیت سے پہلا سفرنامہ ہے ۔ گو کہ ابو عبداللہ مقدسی سے قبل الکندی کتابیں اور ابو الفرج محمد بن اسحاق الندیم "کتاب الفہرست" لکھ چکا تھا مگر ابو عبداللہ مقدسی نے مراکش سے تاشقند تک کا سفر بیس سال کے عرصے میں کیا ۔ اس نے اسلامی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ہر شہر اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں قیمتی معلومات جمع کیں 2۔سفرناموں کی دنیا میں اہم نام ابو ریحان البیرونی کا ہے جس کی " کتاب الہند" 998ء کے عہد کے ہندوستان کا بھر پور نقشہ پیش کرتی ہے 3۔ محمد بن جبیر اندلسی کا نام بھی مسلم سفر نامہ نگاروں میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے ۔ ان کا سفر نامه" رحلته بن جبير " 581ھ اور 585ھ کے اندلس سے بغداد و بغداد سے مکہ مکرمہ کے سفروں کی روئیداد ہے 4۔

سفرناموں کی دنیا میں ابن بطوطہ کا سفرنامہ " عجائب الاسفار" ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ابن بطوطہ نے سفر کا آغاز 1325 ء میں کیا ۔ انھوں نےسعودی عرب ، شام ، ایران، ماوراء النہر، افغانستان، ہندوستان ، چین ، سری لنکا اور دیگر بہت سے ممالک کی سیر کی اور ان کا سفرنامہ ایک پورے عہد کو مجسم صورت میں پیش کرتا ہے 5۔

اٹلی کا سیاح مارکوپولو سیاحت کے میدان میں بہت بڑے مرتبے کا حامل ہے ۔ چالیس سال تک مسلسل سفر میں رہنے کے بعد اس نے سفرنامہ ترتیب دیا 6اور دنیا کی متعدد زبانوں میں اسکا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک اہم سفرنامہ ہے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے ۔ ان اہم سفرناموں کے علاوہ بھی چند ایک قدیم سفرنامی دستیاب ہوئے ہیں ۔

اردو سفرنامہ نگاری کا آغاز و ارتقاء

مشرق میں سفر نامے کی روایت مغرب سے قدیم ہے ۔یہ پہلے عربی زبان میں "مقامات " اور "سفر وسیلہ ظفر" کے طور پر موجود تھی ۔جس میں زیادہ تر حج کے سفرنامے تھے۔اردو میں بھی یہ روایت فارسی سے آئی اور فارسی میں عربی سے۔پہلے پہل اردو ادب نے تراجم کی صورت میں سفرناموں سے استفادہ شروع کیا۔ جن میں فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں کے تراجم شامل تھے۔ ایرانی سیاح حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ" دار المسافرین" جس کو اردو ترجمہ مولوی عبدالرزاق کانپوری نے کیا۔ اسی طرح" عجائب الاسفار" جس کا گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے اس کا اولین اردو ترجمہ پیرزادہ محمد حیات الحسن نے "سفر نامہ ابن بطوطہ " کے نام سے کیا ۔ جو پہلی بار امرتسر سے 1901 میں شائع ہوا7۔ اسی طرح صوفیاء کے ملفوظات میں بھی سفرنامے کا عنصر موجود ہوتا تھا جس سبب برصغیر کے لوگ اس صنف یا انداز تحریر سے غیر مانوس نہیں تھے 8۔ تقریباً سترہویں صدی عیسوی میں مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر فرانس برنیر 1656 تا 1668 ہندوستان میں قیام پزیر رہا ۔ ہندوستان سے متعلق اسکےکئی اوراق پر مشتمل سفر نامے کا ابتدائی ترجمہ سابق وزیراعظم پٹیالہ سید محمد حسین نے دو جلدوں میں کیا۔ یہ ترجمہ اول اول مرادہ آباد سے 1888 عیسوی میں شائع ہوا اور اس کا دوسرا ایڈیشن 1903 میں آگرے سے شائع ہوا۔9عربی اور فارسی کی طرح انگریزی سے اردو میں منتقل ہونے والے سفر ناموں کی فہرست بھی طویل ہے۔ جن کا مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب میں کچھ تذکرہ کیا ہے لہذا ان میں سے چند کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

1۔ سفرنامہ ایران ، طبع اول مطبع حمید پریس لاہور ، 1906

جنرل ٹامس ایڈورڈگارڈن/ محمد انشاءاللہ طبع دوم قریشی بک ایجنسی لاہور ، 1923 سے قبل

2۔" اعمال نامہ روس" از ڈاکٹر وی میکنزی مترجمہ پنڈت رتن ناتھ سرشار مطبوعہ نول کشور لکھنؤ طبع اول 1887 ص 1282

3۔ "اسٹینلے سیاح افریقہ "

ہنری ایم اسیٹینلے/ نام مترجم ندارد مطبوعہ مطبع فیص بخش اسٹیم پریس فیروز پور 1908 صفحات 83 10

کوئی زبان جیسے جیسے آگے بڑھتی گے ادب کی مختلف اصناف اس میں اپنا مقام بناتی جاتی ہیں اور یہ اصناف معاشرے و زبان کی ترقی کے ساتھ پھلتی پھولتی ہیں ۔ اردو زبان کا ابتدائی اظہار کا مِڈیم داستان اور شعر تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اردو زبان جدید اصنافِ ادب سے تراجم اور معاشرے کی ضرورت کے تحت روشناس ہوتی چلی گئی اور فورٹ ولیم کالج کی نثری تحریک اور پھر علی گڑھ تحریک نے اسے متنوع موضوعات اور خیالات سے ہم آہنگ کیا۔

اردو ادب میں سفرنامہ نگاری کا آغاز یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے " تاریخ یوسفی " سے ہوا ۔ یہ سفرنامہ "عجائبات فرنگ " کے عنوان سے زیادہ مشہور ہے 11۔ بقول مرزا حامد بیگ:

" حقیقت حال یہ ہے کہ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کا یہ سفرنامہ پہلی بار "تاریخ یوسفی" کے نام سے پنڈت دھرم نرائن کے زیر اہتمام مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ تاریخ یوسفی کا سنہ طباعت 1263 ہجری مطابق 1847ء ہے۔"12

سفرنامہ" تاریخ یوسفی" 1873ء میں دوبارہ مکتبہ نولکشور سے شائع ہوا جہاں اسکا نام تبدیل کرکے "عجائبات فرنگ" رکھا گیا13۔ اور اس میں ہمیں قدیم عہد کا انگلستان ایک فطری سیاح کی نظر سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے14۔ اس طرح " عجائبات فرنگ " اردو کا پہلا سفر نامہ قرار پاتا ہے ۔ نواب کریم خان کا سفرنامہ لندن " سیاحت نامہ" 1839ء میں سامنے آیا۔ انہوں نے یہ سفر لندن بہادر شاہ کے سفیر کی حیثیت سے اختیار کیا تھا15۔ سید فدا حسین کا سفرنامہ "تاریخ افغانستان" کے نام سے 1852 میں شائع ہوا۔ مسیح الدین علوی کا سفرنامہ" تاریخ انگلستان" اردو کے ابتدائی سفرناموں میں اہم مقام رکھتا ہے ۔ یہ سفرنامہ 1863 میں مکمل ہوا۔16

عہد سرسید کے سفرنامے 1857ء تا 1900ء

1857 ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ادب کی دنیا میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ دیگر بہت سی اصناف کے ساتھ ساتھ سفرنامے لکھنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا۔ یورپ کی طرف سفر کا رجحان عام ہوا ۔ عہد سرسید کے بیشتر سفرنامے یورپی ممالک کے سفرنامے ہیں اور ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے سفرنامے بھی ملتے ہیں۔ سرسید احمد خان کا سفرنامہ " مسافرانِ لندن" 1869کے دور کا اہم سفرنامہ ہے۔17سرسید کے اس سفرنامے کا مقصد مغربی طرز تعلیم اور تہذیب و معاشرت کا مطالعہ تھا ۔ اس اعتبار سے یہ اس دور کے لندن کو تہذیبی پس منظر کے ساتھ سامنے لاتا ہے18۔ ان کا دوسرا سفرنامہ "سفرنامہ پنجاب" 1884ء میں اختیار کیے گئے سفرِ پنجاب کی روئیداد ہے 19۔ ہنری پامر کا سفرنامہ " سفرنامہ پامر" کسی مستشرق کا پہلا سفرنامہ ہے جو اردو میں لکھا گیا 20۔ یہ سفرنامہ اودھ اخبار سے سامنےآیا۔

مولانا جعفر تھانسیری کا سفرنامہ " کالا پانی" جو جزایر انڈیمان میں سترہ سال دس ماہ کی قید کے حالات کا بیان ہے جو انھوں نے ایک سیاسی قیدی کے طور پر گذاری۔ اس سفرنامے میں آپ بیتی کا رنگ غالب ہے ۔ کالا پانی جزیرے کی زندگی کی مکمل تصویر اس سفرنامے میں ہمیں جزئیات سمیت ملتی ہے 21۔ نثار علی بیگ کا سفرنامہ یورپ بھی سرسید عہد میں یورپ کے سفر پر مشتمل ہے22۔

محمد حسین آزاد کا سفرنامہ " سیر ایران " ایک اہم سفرنامہ ہے۔ 1886ء میں یہ سفرروس کے لیے علمی و تحقیقی مقاصد کی ٖغرض سے اختیار کیا گیا تھا 23۔نواب محمد عمر خان نے اس دور میں 7 عدد سفرنامے پیش کئے ان میں " زادِ سفر " اندرون ملک شہروں کا سفرنامہ ہے 24۔ سفرنامہ " زاد غريب" عرب ، عراق ، عجم اور مصر و شام کا سفرنامہ ہے 25۔ نواب محمد عمر خان نے 1888ء میں یورپ کی سیاحت کی۔ سفرنامہ " آئینہ فرنگ " میں لندن ، بيرس ، اٹلی ، سوئٹزرلینڈ اور ترکی کے سفر کے حالات بیان کئے ہیں ۔ " سفرنامہ رئیس" لنکا کا سفرنامہ ہے۔ برما کا سفرنامہ " نیرنگ رنگون" کے عنوان سے اور چین کا سفر نامہ " نیرنگ چین" کے نام سے پیش کیا ۔"فرہنگ فرنگ معہ آہنگ فرنگ " ماسکو ، بورڈاپسٹ ، بلجئیم ، جرمنی اور یورپ کے متعدد ممالک کا سفرنامہ ہے۔ اس کے علاوہ اندلس کا سفرنامہ " قند مغربی " کے عنوان سے لکھا اسطرح انہیں اس دور کا باقاعدہ سفرنامہ نگار قرار دیا جا سکتا ہے ۔26

شبلی نعمانی کا سفرنامہ " روم و مصر و شام " علمی و ادبی نوعیت کا سفر نامہ ہے۔ سرسید احمد خان اور آزاد کی طرح اس سفر کی نوعیت بھی مقصدی ہے ۔27

نواب حامد علی خان کا سفرنامہ " سیر حامدی " اردو کا پہلا سفرنامہ ہے جو پوری دنیا کے سفر پر محیط ہے ۔28ڈاکٹر شاه علی سبزواری کا سفرنامہ " خوفناک دنیا" 1899ء کی براعظم افريقہ کی سير سے متعلق سفرنامہ ہے 29۔بابواما شنکر کا سفرنامہ" آئینہ سکندری 1886ء کے سفر یورپ کی یادگار ہے30۔ مولوی عبد الخالق موحد کا سفرنامہ"سیر برہما" مذہبی نوعیت کا سفرنامہ ہے۔ لالہ بیج ناتھ کا سفرنامہ" انگلینڈ اور انڈیا" سرسید دور کے سفرناموں میں شامل ہے ۔ یہ 1897 عیسوی میں شائع ہوا۔

عہد سرسید میں حج کے سفرنامے

سفر حج اور اسکے تاثرات کے بیان کے لئے بہت سے لوگوں نے حج نامے تحریر کیے ہیں۔ ایسی ابتدائی کتب فارسی زبان میں ہیں۔ سرسید عہد سے پہلے برصغیر میں حج نامہ نگاروں میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ حجاز " جذب القلوب الى ديار المحبوب " فارسی زبان کا قدیم ترین سفرنامہ شمار ہوتا ہے 31۔ اسکا ترجمہ اردو میں محمد شفیع مراد آبادی نے" دیار حبیب " کے نام سے کیا ہے ۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ ولی الله کا سفرنامہ " فيوض الحرمين " 1728ء کے سفر حج کی یادگار ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ یہ سفرنامہ کافی مقبول ہے ۔ 32

سرسید دور میں لکھے جانے والے حج ناموں میں اردو زبان کا پہلا سفرنامہ حاجی محمد منصب علی خان کا سفرنامہ " ماہ مغرب" جو" کعبہ نما " کے عنوان سے بھی مقبول ہے ۔ 1871ء کے سفر حج کے واقعات پر مشتمل ہے33۔ اردو میں لکھے گئے دیگر اہم حج ناموں کی تفصیل درج زیل ہے:

1۔ سفرنامه حرمین شرفین از سید کاظم حسین شیفتہ طبع اول 1893

2۔ سفر نامہ حرمین الشرفین از حکیم محمد محی الدین حسین طبع اول 1903ء

3۔سفر نامہ حجاز و مصر"از نواب احمد حسین خان طبع اول 1903ء

4۔ "ریاض الحرمين"از حاجی نور الدین قصوری طبع اول 1904ء

5۔ سفر حرمین الشرفين"از خان بہادر محمد عبدالرحیم طبع اول 1910ء

6۔ " سفرنامہ حجاز و مصر و شام" از خواجہ حسن نظامی طبع اول 1911ء "34

اس کے علاوہ اندرون ہند میں منشی امین چند کا سفرنامہ اندرون ہند کا سفر نامہ ہے یہ سفر انہوں نے 1850 تک 1852 تک کیا ۔اس سفر نامےکا مقصد طالب علموں کے لیے تاریخ اور جغرافیہ کا ذوق بڑھانا تھا ا۔س سفر نامہ میں جغرافیا اور تاریخ قلم بند کیے گئے ہیں35 ۔ اس کے علاوہ " روزنامچہ سیاحت کشمیر" ریاست کپور تھلہ کے فرماروا سرکار کپور تھلہ کا سفر نامہ ہے جو 1889 کے سفر کی یادگار ہے36۔ حافظ عبدالرحمن امرتسری نے 1898 میں اندرون ہند کا سفر کیا اور اسے" سیاحت ہند" کے نام سے شائع کروایا37۔ سر سید احمد کے دور میں منظوم سفر نامے بھی ملتے ہیں جن میں منیر شکو ہ آبادی کا سفرنامہ 1892 میں شائع ہوا۔ اس سفر نامے میں باندہ سے انڈیمان تک کے سفر کا حال و راستے کے مسائل کا ذکر ہے۔ اسی طرح واجد علی شاہ کا سفر نامہ حزن اختر بھی منظوم صورت میں ہے۔حزن اختر ان کے سوانح عمری کا ایک حصہ ہے اس منظوم حصے میں معزولی کے بعد لکھنو سے کلکتہ تک کے سفر کے حالات بیان کیے ہیں38۔ اگر ہم مجموعی طور پر عہد سرسید احمد خان کے سفرناموں کا جائزہ لیں تو اس دور کے سفر ناموں کا غالب رجحان مقصدیت اور اصلاح قوم ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے سفرنامہ نگار مغربی چکا چوندی سے بہت حد تک متاثر نظر آتے ہیں اور اس عہد کے سفرنامے اسلوب کے لحاظ سے سادہ نوعیت کے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اردو سفرنامے کے جو ادوار بیان کیے ہیں ان میں وہ 1901 تا 1940 تک کے عہد کو اردو سفرنامے کا عبوری دور ثابت کرتے ہیں ۔

اردو سفرنامے کا عبوری دور 1901 تا 1940ء

یہ دور قدیم سفرناموں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ سفرناموں کا دور ہے جس میں فن اور مشاہده زیاده بلندی پر ہیں۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ دور جدید سفرنامے کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور جدید سفرنامہ نگاروں نے اپنے چراغ اس عہد کے سفرناموں کی لو سے روشن کئے اس طرح یہ عبوری دور خاصی اہمیت کا حامل ہے ۔اردو سفر نامے کے عبوری دور میں منشی محبوب عالم کے دو سفرنامے " سفرنامہ یورپ " اور " سفرنامے بغداد " اہمیت کے حامل ہیں 39۔ ان کا "سفرنامہ یورپ " بلاد مصر ، روم اور شام کی سیاحت کا یادگار سفرنامہ ہے۔ جبکہ" سفر نامہ بغداد " بغداد ، عراق اور عرب کی سیاحت پر مشتمل ہے ۔40

نواب فتح علی خان کا سفرنامہ " سیاحت فتح خانی" فرانس، اٹلی ، انگلستان ، سسلی ، بلغاریہ اور حجاز اور روم و کربلا کے وقتاً فوقتاً اختیار کئے گئے سفر کی روئیداد ہے ۔مولوی عبدالرحمان امرتسری کا سفرنامہ "بلاد اسلامیہ" مصر ، شام ، روم ترکی کا 1898 عیسوی میں کیا گیا سفر ہے۔41

ڈاکٹر حاجی محمد حسین کا سفرنامہ "1907ء کا جاپان " اس دور کا سفرنامہ ہے ۔ نازلی سلطان بیگم کا سفرنامہ " سیر یورپ " یورپ کے سفر کے دوران لکھے گئے خطوط سے مرتب کیا گیا۔ اسی طرح عطيہ فیضی کا سفرنامہ " زمانہ تحصیل" بھی ہمشیرہ کے نام خطوط سے مرتب کیا گیا ہے ۔ شاہ بانو کا سفرنامہ " سیاحت سلطانی " کے نام سے شائع ہوا۔42

رسالہ " مخزن" کے مدیر شیخ عبد القادر نے دو سفر نامے تحریر کیے۔ جن میں سے ایک ترکی کی سیاحت (1906)پر مشتمل سفرنامه" مقام خلافت " کے عنوان سے پیش کیا ۔یہ سفرنامہ 1920 میں شائع ہوا ۔ اوردوسرا مغربی ممالک کی سیاحت پر " سیاحت نامہ یورپ" کے عنوان سفرنامہ تحریر کیا ۔43

اس دور میں محمد حمید اللہ خان نے " سفر نامہ قسطنطينہ " اور خواجه ظلام الثقلین نے "روزنامچہ سیاحت " کے عنوان سے سفر نامے تحریر کئے۔ خواجہ حسن نظامی نے "سفرِ مصر ، فلسطین و شام "کے عنوان جو سفرنامہ تحریر کیا اور اس کی خاص بات اس کی ڈائری کی تکنیک ہے44۔ قاضی عبد الغفار نے " نقش فرنگ " کے عنوان سے سفرنامہ لکھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے" قابل میں سات سال" کے عنوان سے سفر نامہ لکھا ان کا یہ سفرنامہ خالص سیاسی نوعیت کا سفر تھا۔ محمد وارث علی وارث کا سفرنامہ " جديد سفرنامہ مصر و شام" ، شوکت عثمانی کا سفرنامہ " مری روس یاترا " اور قاضی ولی محمد کا "سفرنامہ اندلس" سفرنامے کے اسی عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔

اصغری بیگم حیا نے اپنی زندگی میں بہت سے سفر کئے اور "سیر بہار و بنگالہ" سیاحت جنوبی ہند " " سفرنامه عراق " اور " سفرنامہ یورپ" کے عنوان سے چار سفرنامے اردو ادب کو عطا کئے ۔

علامہ اقبال نے متعدد مرتبہ یورپ کا اور ایک مرتبہ افغانستان کا سفر کیا۔ اس کا حال خطوط میں بیان کرتے رہے۔ ان خطوط سے ایک سفرنامہ بعنوان " سفرنامہ اقبال" محمد حمزہ فاروقی نے ترتیب دیا اور ایک سفرنامہ پروفیسر حق نواز نے "سیاحت اقبال " کے نام سے یورپ کے سفر کے احوال سے متعلق مرتب کیا جو کتابوں ، رسائل، اخبارات اور خطوط اخذ کیے۔1922 سے 1928ء تک پنڈت شیو نرائن شمیم نے اندرون ملک ہندووں کے مقدس مقامات کی سیر کی اور اس سفر کی یادگار کے طور پر " سفرنامہ شمیم" پیش کیا جو 1935ء میں شائع ہوا 45۔

"سفرنامہ برہما" سید ابو الظفر ندوی کے 1915ء کے سفر برہما کی یادگار ہے۔ ایم ، شجاع منصی نے 1930ء میں شیراز ، ایران اور اصفہان کا سفر کیا اور اس سفر کا احوال " کتاب ایران " میں بیان کیا۔ یعقوب علی عرفانی کا بلاد اسلامیه کا سفرنامہ " مشاہدات عرفانی " کے نام سے شائع ہوا ۔ شاه افغانستان غازی امان الله نے ہندوستان ، عدن ، مصر، اٹلی ، جرمنی ، فرانس ، انگلستان اور روس وغیرہ کے سفر کے حالات " شاہ افغانستان" کے عنوان سے پیش کیے۔ "حج نامہ " اور عراق کے سفر پر مشتمل "سیاحت نامہ"بیگم حسرت موہانی کے سفر نامے ہیں ۔ حاجی ، ایس ، ابن علی نے مصر ، طرابلس ، دمشق اور عراق کے سفر کے بارے میں "روزنامچہ مقدس" کے عنوان سے سفرنامہ تحریر کیا ۔ نواب محمد ظہیر نے 1933ء میں یورپ اور امریکہ کا سفر اختیار کیا اور " سیاحت نامہ" کے عنوان سے ان کا سفرنامہ اسی سفر کی یادگار ہے۔46

مصر ، شام ، عراق اور فلسطین کا علمی نوعیت کا سفرنامہ " سفرنامہ صارم" عبد الصمد صارم کی سفری کاوش ہے ۔ سفرنامے کے اس عبوری دور میں ہارون خان شیروانی کا سفرنامہ " یورپ جنگ سے پہلے" بھی شامل ہے ۔سید سلیمان ندوی نے نادر شاہ کی دعوت پر تعلیمی نوعیت کا سفر 1933 عیسوی میں اختیار کیا اور سفر کے مشاہدات" سیر افغانستان" کے عنوان سے قلم بند کیے۔ 47

1901ء سے 1940ء تک پھیلے ہوئے سفرنامے کے عبوری دور نے اردو سفرناموں کو ایک نیا موڑ دیا اور ایک پختگی کی طرف راغب کیا اور باقاعدہ سفرنامہ نگاری کا آغاز ہو گیا۔ مغربی ممالک اور مشرق وسطیٰ کے سفر کے ساتھ ساتھ لوگ مقامات مقدسہ کے سفر بھی اختیار کرتے رہے۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے اختیار کئے گئے سفر کا احوال لکھنے کا رحجان پہلے کی نسبت زیاده ہوا ۔ چنانچہ اس دور میں بہت سے حج نامے بھی سامنے آئے جو سفر نامے کے ابتدائی دور کی نسبت زیادہ متاثر کن اور زیادہ حقیقی اسلوب کے حامل ہیں ۔ ذیل میں سفرنامے کے عبوری دور میں سامنے آنے والے حج ناموں کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں ۔

1901 میں شائع ہونے والا سفرنامہ" زاد الزائرین " مرزا قاسم بیگ کے سفر حجاز ، عرب ، بغداد اور عراق کی یادگار سفرنامہ ہے۔ مولوی سبحان الله گورکھپوری کا "میرا سفر حج " 1903ء میں شائع ہوا ۔حاجی احمد حسین خان نے " سفرنامہ حجاز و مصر " پیش کیا جس میں دیگر ملکوں کے حالات کے ساتھ حج نامہ بھی شامل ہے یہ 1904ء میں سامنے آیا ۔محمد لطیف مچھلی شہری نے حج بیت اللہ کے متعلق اپنی تحریر 1904ء میں پیش کی 48۔ اس دوران 1940 تک اندرون ہندوستان کے بھی بہت سے سفرنامے لکھے گئے جن میں راشد الخیری کا سفرنامہ " سیاحت ہند" اندرون ہندوستان کا عمدہ سفرنامہ ہے۔

اردو سفرنامے کا عہد زریں 1941 تا 1984

1941ء سے 1984ء تک اور اسکے بعد کے دور کو اردو سفرنامے کا عہد زریں کہا جاتا ہے کیونکہ اس عہد میں سفرنامہ باقاعدہ صنف ادب کے طور پر سامنے آیا اور ساتھ ہی اسکی ادبی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ۔ سفرنامے کے آغازکے دور میں مشاہدات و تجربات اور تاثرات کو اہمیت دی جاتی تھی ۔ پاکستان بننے کے بعداسکے ساتھ ساتھ مغربی علوم اور تاریخ سے بھی مدد لی گئی اور یوں سفرنامے کا رنگ ڈھنگ بدل گیا ۔

سفرنامے کے عہد زریں میں دیگر ادبی اصناف کی طرح سفرنامہ میں میں بھی نئے نئے تجربات کئے گئے اور ساتھ ہی اسلوب میں بھی واضح تبدیلی آئی ، اور قیام پاکستان کے بعد موجودہ حال تک سفر نامہ بڑی تیزی سے ترقی کرتا جا رہا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے 1938ء میں ورلڈ یوتھ کانفرنس نیو یارک میں شرکت کی اور اسی کے تحت سترہ ممالک کا دورہ کیا اور اس سفر کا حال "مسافر کی ڈائری" کے عنوان سے پیش کیا ۔ اس سفرنامے کو ہم جدید سفرنامے کی طرف پہلا قدم کہہ سکتے ہیں ۔49

آغا محمد اشرف نے بھی روایتی سفرنامے کی بجائے نئے انداز کا سفرنامہ بعنوان " لندن سے آداب عرض " پیش کیا۔ اس سفرنامے میں قیام لندن کے دوران -ریڈیو سے نشر ہونے والے مقامی تاثرات پیش کئے ہیں ۔ اس کے علاوہ انگلستان ، افریقہ اور لنکا کے متعلق ان کا سفرنامہ " دیس سے باہر" کے عنوان سے سامنے آیا ۔50

"سفرنامہ یورپ و امریکہ " نواب لیاقت جنگ بہادر کا سفرنامہ ہے ۔ عشرت علی صدیقی نے" لینن گراڈ تا سمر قند " کے عنوان سے سفرنامہ لکھا ۔محمود نظامی " کا " نظر نامہ" اردو سفرنامے کو ایک نیا موڑ دینے کا باعث بنا ہے ۔ اس سفرنامے میں حال اور ماضی کا سفر ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ انہوں نے رڈیو نشر گاہوں کے تجربات سمیٹنے کی غرض سے دوسرے ملکوں کا یہ سفر کیا تھا51۔اس سفرنامے کے حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی رائے کچھ یوں ہے :

"محمود نظامی کا "نظر نامہ" 1959 ایک ایسی تحریر ہے جو لکھی تو گئی رپورتاز کے انداز میں لیکن شہرت اسے ملی سفرنامے کے طور پر یہاں تک مختلف انتھالوجیز اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی سفرنامہ ہی شمار کیا گیا۔"52

بیگم اختر ریاض الدین اردو سفرنامے کی دنیا میں ایک اہم اور بڑا نام ہے ان کے دو سفرنامے" سات سمندر پار"1963 اور " دهنگ پر قدم" اردو ادب میں نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے سفرناموں میں قصہ نگاری، چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بیان کرنا ، رنگینی اور لطافت اور اظہار کی جرآت گاہے گاہے علامتوں اور استعاروں کا استعمال اور مذاح کی چاشنی حد درجے نمایاں ہے"۔53سید اختشام حسین کا سفرنامہ " ساحل اور سمندر" قيام امريكہ اور لندن اور پیرس کے سفر کا حال ہے - محمد مظہر الدین صدیقی کا سفرنامہ "امریکہ کے تاثرات " تعلیمی مقاصد کے تحت اختیار کئے گئے سفر کے حالات مبنی ہے۔ ممتاز احمد خان کا سفرنامہ " جہاں نما" ایران ، ترکی ، عراق ، ہالینڈ ، جرمنی، فرانس وغیرہ کے سفری حالات کا بیان ہے -

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا سفرنامہ " ارض پاک سے دیار فرنگ تک" 1962ء میں اختیار کئے گئے سفر لندن کا احوال ہے۔ ان کا یہ سفر تدریسی نوعیت کا سفر ہے۔ ان کا ایک اور سفر نامہ " ترکی میں دو سال " بھی تدریسی نوعیت کا سفر نامہ ہے ۔حاجی حیدر علی خان کا سفرنامہ "دنیا کی سیر " عراق، عرب، شام ، ایران ، چین، جاپان ، افریقہ ، جرمنی ، برطانیہ امریکہ اور ہوائی کے سفر پر مشتمل ہے ۔ 54"نیل سے فرات تک ' محمد اقبال انصاری کا سفر نامہ ہے جو خطوط سے ترتیب دیا گیا ہے اور یہ سرکاری نوعیت کا سفر ہے55 ۔ فضل حق شیدا کا سفرنامہ" نیا چین" اردو کا پہلا سفر نامہ ہے جو آزاد چین کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ سعید اختر دورانی کا سفر نامہ "چند روز آغوش فطرت میں" لندن کا سفرنامہ ہے۔ "تاثرات روس "مولانا عبدالحامد بدایونی کا روس کا مذہبی نوعیت کا سفر ہے جنہوں نے 1957 میں اختیار کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد باقر کا سفرنامہ" لاہور سے لندن تک " ہے ۔ جبکہ دوسرا سفر نامہ "چند مہینے ایران میں" تعلیمی نوعیت کے سفر سے متعلق ہے۔ پطرس بخاری کا سفرنامہ خطوط سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ تعلیمی نوعیت کا سفرنامہ ہے جو "سفرنگلستان "کے عنوان سے شائع ہوا . رازق الخیری نے "سفرنامہ مشرق وسطیٰ "تحریر کیا۔ارد و سفر نامے کے اس زریں عہد میں ڈاکٹر منظور ممتاز کے سفرنامے بھی شامل ہیں ۔ ان میں سے ایک " ارضِ خیام و حافظ" اور دوسرا "کشور محمود و بابر"ہے ۔ یہ دونوں سفرنامے افغانستان کے مختلف اوقات میں کیئے گئے سفر سے متعلق ہیں ۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے چین کے سفر کے تاثرات "چین کی حقیقتیں اور افسانے" کے عنوان سے قلمبند کئے ، شاہ محمد عزیز نے 1964ء میں صحافی کی حیثیت سے ماسکو کا سفر کیا ۔" لائل پور سے ماسکو تک" اسی سفر کی یادگار ہے ـ ڈاکٹر سید عابد حسین کا سفر نامہ "رہ نورد شوق " بھی اسی دور میں سامنے آیا اور یہ سفر نامہ ان کی بیگم صالحہ عابد حسین نے ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات سے تلاش کر کے مرتب کیا۔ خلیل احمد حامد نے 1968ء میں ترکی کا سفر کیا اور سفرنامہ " ترکی قدیم و جدید " کے عنوان سے لکھا ۔ جمیل صبا کا سفرنامہ "سفر ہے شرط" ایران ، عراق ، اور ترکی کے سفر کے حالات پر مشتمل ہے۔ خواجه عبدالرشيد نے بیرون ملک سے مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے نام خطوط میں سفر کے حالات لکھے جنہیں " سیر فرنگ" کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے۔ احسان بی ۔ اے کا سفرنامہ " روس میں آٹھ دن" سرکاری اخبار نویس کی حیثیت سے کیے گئے سفر کی روئیداد ہے۔ سید ابوالحسن ندوی کا سفرنامہ " ترکی میں دو ہفتے " علمی اور مذہبی مقاصد کے لئے اختیار کیے گئے سفر کا احوال ہے۔ جبکہ " کابل سے یرموک تک" افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور اردن کا سفرنامہ ہے ۔ امت القدیر کا سفر نامہ سری لنکا" کراچی سے چاٹ گام تک" کے عنوان سے حالات سفر پیش کیے ۔ اسی دور 1970 کے عہد میں رفیق ڈوگر صاحب نے بھی لکھنا شروع کیا ۔ جدید سفرنامے میں مستصر حسین تارڑ کا نام نمائندہ اہمیت کا حامل ہے ۔ تارڑ نے سفرنامے کو ایک نئے دور میں داخل کیا ان کی فطرت میں ایک سچا سیاح موجود ہے۔ وہ ایک ہنس مکھ کردار ہیں ۔ انھیں ویرانوں پر بھی ہنسی مزاح کے طریقے سوجھ جاتے ہیں ۔ وہ ایک پیدائشی سیاح ہے ۔ جو ہر لمحہ نئی دنیاوں کی دریافت پر کمربستہ رھتا ہے۔ ان کے ہاں تخیل کی آمیزش نے سفرنامے میں رومانوی عنصر پیدا کر دیا ہے۔ رفیق ڈوگر صاحب کے ہاں بھی تخیل و رومانویت کا رنگ نہایت نکھرا ہوا اور گہرا ہے ۔ خصوصاً انکا سفرنامہ "اندلش کی تلاش" میں انکا اسلوب نہایت رومانوی ہے۔ اس کے علاوہ سید وجاہت علی نے 47 سے زائد ملکوں کی سیاحت کی اور سفر نامے لکھے اور حکیم محمد سعید نے بھی کوریا جرمنی وغیرہ کے سفر کیے اور سفرنامے لکھے۔قدرت اللہ شہاب کی ادبی شخصیت سے کون واقف نہیں ۔ انھوں نے بھی اس دور میں اردو ادب کو دو سفرنامے عطا کئے جن میں ایک " اے بنی اسرائیل " اور دوسرا سفرنامہ " تو ابھی راہ گذر میں ھے " کے عنوان سے شائع ہوا۔

اسی دور میں مقبول بیگ بدخشانی نے سرزمین "حافظ و خیام " کے عنوان سے سفرنامہ لكها ۔مولانا محمد زکریا کا سفرنامہ " سفرنامہ افریقہ و انگلینڈ " مذہبی نوعیت کا سفرنامہ ہے۔اختر امان کا سفرنامہ "جزیرہ" سری لنکا کے سفر پر مبنی ہے۔ تاج محمد لنگاہ کا" چِین ہے تو چین ہے " چین کا سفرنامہ ہے۔ محمود شام کا سفرنامہ " کتنا قریب کتنا دور" سفر شندوستان کی یاد گار ہے ۔عبد الله ملک نے صحافی کی حیثیت میں کئی ممالک کے سفر اختیار کئے او مشاہدات سفر " کیوبا سے چند خطوط"، " پولینڈ ایک سفر ایک جائزہ" " صوفیہ سے چند خطوط " اور " ارض جنت سویت یونین " کے عنوان سے سفر ناموں میں بیان کیے۔

مجاہد بریلوی نے انقلاب افغانستان کے مطالعاتی سفر کے بارے میں " طور خم کے اس طرف " کے عنوان سے سفرنامہ تحریر کیا ۔ محمد عباس قمر زیدی نے شاہ ایران کے زوال کے بند کے ایران کا احوال " پانچ ہفتے خمینی کے دیس میں" کے عنوان سے لکھا۔ ریاضی احمد ریاض کا سفرنامہ " برسبیل سفر" کینڈا ، امریکہ اور لندن کے سفر سے متعلق ہے ۔ " الریاضی کی سیر " اشفاق نقوی کا سفرنامہ ہے ۔ میاں غلام قادر نے جرمنی ، فرانس ، ہالینڈ اور برطانیہ سے متعلق " سفرنامہ یورپ " تحریر کیا۔ ذوالفقار علی کا سفرنامہ "یاد یار مہربان "طالب علمانہ حیثیت میں کیا گیا سفر هے ـ جمیل زہری کے سفرِ لندن اور امریکہ کی یادگار" دھوپ کنارہ" ہے -مرزا ادیب نے ادیب کی حیثیت سے چین کا سفر 1982ء میں اختیار کیا تھا اور سفر کی یادگار ان کا سفر نامہ "ہمالہ کے اس پار " ہے ۔ اسد گیلانی نے ایران کا مذہبی نوعیت کا سفر 1983ء میں کیا تھا اور "سفرنامہ ایران" کے عنوان سے مشاہدات سفر قلمبند کیے ۔

مولانا کوثر نیازی کا سفرنامہ " ایک ہفتہ چین میں" سرکاری نوعیت کا سفر هے ـ ہمایوں ادیب کے سیاسی نوعیت کے سفر عراق کی یادگار ان کا سفرنامہ " فجر الا النسان" ہے اس زرین دور میں شریف فاروق کے دو سفر نامے سامنے آئے جن میں ایک" اتاترک کے وطن میں" اور دوسرا سفرنامه " "لنکن کے وطن میں" ہے ۔ اسی دور میں رفیق ڈوگر صاحب کا سفرنامہ اے آب رود گنگا منظر عام پر آیا ۔ جو ہمارے مقالے کا موضوع سفرنامہ ہے۔ اس کے علاؤہ محمد حمزہ فاروقی نے اسپین کا سفرنامہ" آج بھی اس دیس میں "کے عنوان سے لکھا ہے ۔ سفرنامے کے اس دور میں نئی جدتوں اور اضافوں کے ساتھ جو تجربات ہوئے ان میں فردوس حیدر کا سفرنامہ " دائروں میں دائرے" ناول کی طرز میں سفرنامے کی مثال ہے اور ڈاکٹر فرخندہ جالی کا " گرین کارڈ " بھی اسی نوعیت کا حامل سفرنامہ ہے 56۔ اس کے علاوہ سفر نامے کے عہد زریں میں بہت سے حج کے سفر نامے بھی لکھے گئے جن میں مولانا مسعود عالم ندوی کا " دیار عرب میں چند ماہ" اور سرزمین حجاز کے متعلق سفر نامہ" ارض القرآن " سید ابوالاعلی مودودی کا سفر نامہ ہے57۔ اور اس طرح نسیم حجازی نے 1959 میں سرکاری وفد کے رکن کے حیثیت سے ایران ترکی اور حجاز کے سفر کیا اور ان کا سفرنامہ" پاکستان سے دیار حرم تک" اسی سفر کی یادگار ہے۔

اردو سفرنامے کے عہد زریں میں ہندوستان کے سفرنامے

پاکستان سے ہند جانے والوں کے سفرناموں کی فہرست میں پروفیسر حمید احمد خان کا سفر ہند شامل ہے جو "میری بھارت یاترا" کے عنوان سے شائع ہوا ۔ جنوبی هند " میں دو ہفتے " جگن ناتھ آزاد کا اندرون ہند کا سفرنامہ ہے ـ

"اٹک سے بمبئی تک" پریم رتن وهره کا سفر نامہ ہے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ، " ایک طویل ملاقات " کے عنوان سے مشاہدات سفر ہند تحریر کیے۔انتظار حسین کا سفر نامہ "زمین اور فلک" کے عنوان سے سامنے آیا ۔جمیل زبیری کا سفرنامہ " موسموں کا عکس" کے عنوان سے سامنے آیا - "مانوس اجنبی " شیخ منظور الہی کا سفرنامہ ہند هے. اوپر گزر چکا ہے رفیق ڈوگر کا سفرنامہ بھارت " اے آپ رو گنگا " اردو ادب میں اہم اضافہ قرار دیا گیا ہے ۔56

ڈاکٹر ملک حسن اختر کا سفرنامہ " ایک ہفتہ دہلی میں" حضرت امیر خسرو کے عرس کے موقع پر اختیار کیا گیا سفر ہے ۔ عرفان علی شاد نے سفر ہند کے مشاہدات " قدم بہ قدم" کے عنوان سے تحریر کئے" مقبوضه هندوستان" سید انیس شاہ جیلانی کا 1982ء میں اختیار کئے گئے سفر کا احوال ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مشاهدات سفر " دید و بازدید " کے عنوان سے پیش کیے ۔

اسی طرح اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دور حاضر میں لکھنے والوں میں مستنصر حسین تارڑ کا نام نمایاں ہے اس کے علاوہ دور حاضر میں لکھنے والوں میں سلمی اعوان بھی خاصی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ مگر فن کی جو پختگی ہمیں 1947 سے 1984 تک ملتی ہے آج کے لکھنے والوں میں وہ مفقود ہے ۔

حوالہ جات

1۔ انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص 69

2۔ایضاً، ص :73

3۔ ایضاً ، ص :75

4۔ ایضاً ، ص: 78

5۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص 16

6۔ ایضاً

7۔ ایضاً

8۔ ایضاً ، ص :18

9۔ ایضاً

10۔ ایضاً ، ص: 20

11۔ انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص :102

12۔مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص: 46

13۔ ایضاً ، ص: 47

14۔انور سدید ، ڈاکٹر ، "اردو ادب میں سفرنامہ" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص: 107

15۔ ایضاً ، ص: 109

16۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص: 57

17۔ ایضاً ، ص :60

18۔ انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص: 119

19۔ ایضاً ، ص :125

20۔ ایضاً ، ص :126

21۔ ایضاً ، ص :127

22۔ ایضاً ، ص :132

23۔مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص 67

24۔ انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص 146

25۔ ایضاً

26۔ ایضاً

27۔ ایضاً ، ص :147

28۔ ایضاً ، ص :154

29۔ ایضاً ، ص:156

30۔ ایضاً ، ص :157

31۔مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، لاہور،اورینٹ پبلشرز ، 2014ء، ص :27

32۔ ایضاً

33۔انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص :450

34۔مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص :29

35۔انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص :528

36۔ ایضاً ، ص: 533

37۔ ایضاً

38۔ ایضاً ، ص: 598

39۔انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص :170

40۔ ایضاً ، ص: 171 ـ 175

41۔ ایضاً ، ص :179

42۔ ایضاً ، ص: 179 تا 188

43۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص: 78

44۔انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص: 197

45۔ ایضاً ، ص: 222

46۔ ایضاً ، ص: 225 ـ 235

47۔مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،"اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ"اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص 84

48۔ ایضاً ، ص 28

49۔انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص :251تا 252

50۔ ایضاً ، ص: 257

51۔ ایضاً ، ص: 263

52۔مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،اورینٹ پبلشرز ، لاہور ، 2014ء، ص :95

53۔ ایضاً ، ص :101

54۔ انور سدید ، ڈاکٹر ،اردو ادب میں سفرنامہ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص :277 تا 295

55۔ ایضاً، ص :296

56۔ ایضاً ،ص :251

57۔انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء، ص 277 تا 295

55۔ ایضاً، ص: 475

56۔ ایضاً ، ص :544 تا 554

باب دوم

رفیق ڈوگر احوال و آثار

معروف صحافی محمد رفیق ڈوگر کا آبائی تعلق مانا ٹبہ (جڑانوالہ) سے ہے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگلش لٹریچر کا امتحان پاس کیا اور شعبہ صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ اور لاہور کو اپنا مسکن و مدفن بنایا۔ آپ نوائے وقت، جنگ اور اخبار جہاں میں کالم بھی لکھتے رہے اور اپنا رسالہ دید شنید بھی نکالتے رہے۔

رفیق ڈوگر نے 25 سے زائد کتابیں لکھیں۔ جن میں نور القران 6 جلدوں پر مشتمل قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ سب سے زیادہ شہرت آپکو سیرت النبی ﷺ پر لکھی گئی 4 جلدوں پر مشتمل کتاب الامین کو ملی ہے۔ جو دید و شنید پبلشرز سے شائع ہوئی۔

جبکہ حکومت پنجاب کی طرف سے الامین کو بیسٹ بک اور حکومت پاکستان کی طرف سے اعلیٰ ایوارڈ دیا گیا اور صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ نے اس کتاب کی رونمائی کی۔ محمد رفیق ڈوگر کی کتب نا صرف پاکستان بلکہ برٹش لائبریری لندن، انگلینڈ میں بھی رکھی گئی ہیں ۔

20 فروری 2022ء کو لاہور میں وفات پائی، رات آٹھ بجے 61-A راجپوت ٹاون ، بر لب نہر، لاہور میں جنازہ ہوا۔

محمد رفیق ڈوگر کی تصانیف

1 نور القرآن-قران کریم کا ترجمہ اور تفسیر 6جلدیں

2 الامین صلی اللہ علیہ وسلم ـ اللہ کے رسول کی سیرت مبارک 4جلدیں

4 سیرت الامین صلی اللہ علیہ وسلم ـ بچوں کے لیے سیرت مبارک 3 جلدیں

4 دستور مدینہ ـ اللہ کے رسول کا ریاست مدینہ کے لیے تربیت دیا دستور

5 قائداعظم سوچ تے سیاست ـ قائد اعظم کے بارے میں پنجابی زبان میں لکھی کتاب

6 کالے فرشتے پنجابی زبان میں خاکے

7 مغلانی بیگم اردو ناول برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کی اصل کہانی کی صورت میں

8 تعاون اردو افسانے سچی کہانیاں افسانوی انداز میں

9 علامہ اقبال کے شخصی خاکے اقبال کی شخصیت کیسی تھی

10 دید شنید۔ کالموں کا مجموعہ

11 چالیس چہرے پاکستانی سیاستدانوں کے خاکے اس سے پہلے سیاسی خاکوں کی کوئی کتب نہیں تھی

12 چہرے مہرے

13 پاکستان فوج اور سیاست

14 سول اور فوجی سازشیں

15 مولانا مودودی سے ملاقات

16 سیاسی ملاقاتیں

17 ادبی ملاقاتیں

18 اصل ضیاء الحق

سفر نامے

19 اے ب رود گنگا

20 اندلس کی تلاش

21 ور نیل بہتارہا

22جاپان نورد

23 آپریشن صومالیہ

24 آپریشن سیاچن

25 آپریشن بلوچستان

باب سوم

اے آب رود گنگا تجزیاتی مطالعہ

ا)کہانی:

اے آب رود گنگا سفرنامہ پہلی بار 1981ء میں شائع ہوا۔ رفیق ڈوگر صاحب نے یہ سفر ہندوستان 1978ء میں اختیار کیا تھا۔ اے آب رود گنگا کتاب کے 26 ابواب ہیں ۔ باب اول تاریخ کے نقشِ قدم کے عنوان سے ہے۔ سفرنامے کا آغاز بھی اسی باب سے ہوتا ہے ۔ مختصر کہانی یوں ہے کہ مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ داتا دربار سے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ مصنف سفریوں کو تین درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔

" اس کارواں میں کچھ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے زائر شامل تھے۔ کچھ بھارتی فلموں کے زائر اور کچھ مجھ جیسے دِلی کے زائر۔ تہذیب و تاریخِ مسلم کا مزار دِلی۔"1

اس کے بعد مصنف بتاتا ہے کہ سب سفری سفر کے لیے تیار تھے مگر محکمہء اوقاف کی تیاریاں ابھی مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ بسوں کی آمد پر سب مسافران خوش ہوتے ہیں مگر مصنف کو بسوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ بسیں پہلی جنگ عظیم میں حصہ لے چکی ہوں۔ اس کے بعد دوپہر بارہ بجے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ دریائے راوی کی طرف سے واہگہ بارڈر کے لیے روانگی کے دوران مصنف بادشاہی مسجد کا نظارہ کرتے ہی ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے ۔

شاہراہِ اعظم کا استعمال کرتے ہوے رفیق ڈوگر صاحب واہگہ بارڈر پہنچتے ہیں ۔ وہاں قلیوں کی بھرمار دیکھ کر کچھ سکتے میں آجاتے ہیں ۔ سب سفری بھاری سامان کے سبب چیکنگ میں لمبی قطاروں کا سامنہ کرتے اور ذلت کو محسوس کرتے ہیں جبکہ رفیق ڈوگر صاحب بتاتے ہیں وہ کم سامان لانے کے سبب چیکنگ میں دکت سے بچ گئے ہیں۔ چیکنگ سے فارغ ہوکر یہ قافلہ پاکستانی وقت دو بج کر دس منٹ اور بھارتی وقت دو بج کر چالیس منٹ پر بھارت میں داخل ہوجاتا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان " گزرے تھے ہم جہاں سے" ایک رومانوی مصرعے سے ہوتا ہے ۔ واہگہ کے اس پار سب قافلے والے اپنا اپنا وقت درست کرتے ہیں ۔ اور وہاں ان کا استقبال بھارتی قُلی ، پولیس والے ، پاکستانی سفارت خانے کا ایک عدد افسرِ اعلیٰ اور پنجابی ثقافت کے نام پر عریانی زدہ امرتسری کرتے ہیں (آگے فکری باب میں اسے وضاحت سے بیان کیا جائے گا ) ۔ اس کے بعد مصنف بتاتا ہے کہ ان کے پاس پاکستانی کرنسی کے نوٹ تھے بھارتی کرنسی میں ابھی تبدیل نہیں کروائے گئے تھے۔وہ اپنے دوست کو پانچ روپے کا نوٹ دے دیتا ہے کہ اسے ہو سکے تو بھارتی کرنسی میں تبدیل کروا دینا ۔ اس کے بعد چیکنگ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے جو کہ مصنف کے بقول بڑا طویل ہوتا ہے اور مصنف امرتسر کی طرف جانے والی سڑک پر بیٹھ کے دور حد نگاہ تک نظر آنے والے کھیتوں کا نظارہ کرتا ہے اور قلیوں کے چِہروں کی طرف دیکھتا ہے۔ یہاں پر مصنف بہت قسم کے عمرانی اور فکری سوالات اٹھاتا ہے جن کا اگلے باب میں تجزیہ کیا جائے گا۔

بینچ پر بیٹھے ہی ایک بوڑھا قلی مصنف کے پاس آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ وہ بھی لاہور کا رہنے والا تھا ۔ لیکن تقسیم کے بعد ہندوستان آگیا اور وہ مصنف سے سوال کرتا ہے کہ لاہور تو بہت بڑا ہو گیا ہوگا۔ اس کے بعد امرتسر کے لیے سفر شروع ہوتا ہے۔ سفر شروع ہونے سے قبل مصنف ہم وطنوں کی بھارتی بینک کے سامنے تبادلہ زر کی دست بدست لڑائی اور ایک دوسرے کو روندنے کا تذکرہ کرتا ہے۔ امرتسر کے سفر کے درمیان مصنف کا اسلوب بہت جذباتی اور رومانوی ہوجاتا ہے ۔

وہ کھیتوں میں گری سڑک پر پہلے سے گزرے ہوے قافلوں کا سوچتا ہے ۔ پھر وہ اپنی قوم کی زوالِ سلطنت کی وجوہات پر غور کرتا ہے ۔ سڑک پر مصنف کو سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے بچے سکول سے واپس آتے ہوے دیکھ کر اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ یہاں مصنف بچپن کے کچھ کوائف بیان کرتا ہے ۔ اس دوران مصنف کو اپنے گاؤں کا نمبر دار اس کا دوغلا کردار اور اسکی وفات کے بعد لوگوں کے آپس کے لڑائی جھگڑے یاد آتے ہیں ۔ ابھی مصنف انہی خیالات میں گم ہوتا ہے کہ کوئی زائر کہتا ہے وہ دیکھو مسجد ۔ جس پر مصنف بھی کھڑکی کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔

"سڑک سے تھوڑے فاصلے پر گاؤں کے باہر ایک مسجد کے مینار کسی موذن کے انتظار میں دست بدعا تھے۔ صحن کی چار دیواری گر چکی تھی، لیکن عمارت ابھی تک عذابِ تاریخ میں مبتلا تھی۔ صحن کے آس پاس مویشی کھڑے شاہراہ اعظم پر دوڑنے والی بسوں کو دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کی سرحد سے صرف دس میل اِدھر میں اور میرے ساتھی مسجد دیکھ کر اتنے حیران کیوں ہوئے ہیں؟ دل چاہتا تھا بس کچھ دیر رک جائے ! مسجد میں دو رکعت نفل ادا کروں اور اس حیرانی کا سبب دریافت کروں۔"2

باب سوم کا عنوان "سکھوں کے درمیان ایک شام " ہے۔ مصنف اس باب میں بتاتا جوں جوں وہ امرتسر کے قریب ہوتے جاتے کھیتوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور جا بجا چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں کھیتوں میں نظر آنا شروع ہوجاتی ہیں۔ اسی حالت میں مصنف کو گرو نانک یونیورسٹی اور خالصہ کالج کی تاریخی عمارتیں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جوں جوں امرتسر قریب آتا جا رہا تھا سکھوں کی تعداد سڑک پر بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران مصنف کو حیرت ہوتی ہے کہ بھارت جو ہوائی جہاز سے لے کے سائیکل تک میں خود کفیل ہے۔ وہاں انسانوں کو دھکیلنے کے لیے رکشوں کے بجائے سائیکل رکشا (یعنی آدمی آدمی کو کھینچتا )استعمال کیا جاتا ہے ۔

مصنف اپنے دل میں پختہ ارادہ کرتا ہے کہ قیام بھارت کے دوران اس غیر انسانی فعل کا ہرگز ارتکاب نہیں کرے گا۔لیکن اسی کے ساتھ ہی جب مصنف بستی نظام الدین جانے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہاں ایک سائکل رکشے والا آ کر مصنف کو کہتا بیٹھیے۔ مصنف اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد رکشے والا کہتا ہے اگر آپ جیسے لوگ اس سواری کو غیر انسانی سمجھیں گے تو ہمارے پیٹ کیسے پلیں گے؟ جب کہ میں نے ایک گھنٹے بعد چھ روپے نقدی اس کا کرایہ بھی ادا کرنا ہے۔ اگر آپ اور آپ جیسے ے لوگ اس سے اجتناب کرنا شروع کر دیں تو میرے گھر والوں کا پیٹ اور اس سائیکل کا کرایہ کہاں سے ادا ہوگا ؟ ۔ مصنف چپکے سے اس کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ رستے میں کئ باتیں ہوتی ہیں ۔ آگے مصنف ہی کی زبان میں سنیے:

"مقبرہ ہمایوں کی عقبی دیوار کے سایے میں اُسے کرایہ ادا کرتے ہوتے میں نے پوچھا : آپکا نام کیا ہے ؟

"یوسف خان"۔ مجھے اُس کی سوچ پر خوشی ہوئی۔ ہاتھ میں جتنے پیسے تھے میں نے اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے اپنا مقررہ کرایہ کاٹ کر باقی روپے مجھے واپس کر دیے۔ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ افسوس کہ ہم اپنے شہر میں بھی آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکے ! " اُس نے کہا اور سلام کہہ کر رکشا چلاتے ہوئے رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔"3

اس کے بعد مصنف امرتسر میں نظری سیر کے متعلق بتاتا ہے۔ اور بتاتا ہے ہمارا قافلہ اس مقام پر اتر رہا تھا جہاں 1947 میں ہمارے ہزاروں قافلے لٹ گئے تھے۔یہاں ان کا استقبال بھارتی پنجاب کے مشترکہ بورڈ مسلم اوقاف کے چئیر مین چوہدری طیب لدھیانوی اور مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانوی کرتے ہیں ۔ بعد میں ایک بھارتی صحافی سے مصنف کی بھٹو کی گرفتاری کے متعلق بات چیت ہوتی ۔ مصنف بھارتی صحافی کو چند کڑے سوالات کرکے خاموش کروا دیتا۔ اس کے بعد مصنف امرتسر کے بازار اور ریلوے اسٹیشن میں سیر کرتا ہے اور اسے وہاں شیخوپورہ کا ریلوے اسٹیشن اور بازار یاد آ جاتے ہیں۔مصنف کے بقول امرتسر میں ہر طرف سکھ ہی سکھ، خالصے ہی خالصے تھے۔مغرب کی نماز کے بعد اوقاف بورڈ نے پاکستانی مسلمانوں کی باقاعدہ دعوت کی۔ کھانا کھلانے کے بعد انہیں پان پیش کیا گیا۔بعدازاں مصنف ڈیوٹی پر تعینات مختلف لوگوں سے بات چیت کرتا ہے اور اسے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔

کتاب کا چوتھا باب " پنجابی کی شدھی تحریک 'ہے۔اس باب میں مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ محکمہ اوقاف کے درس انسانیت اور دعوتوں سے چھٹی رہی تو انہوں نے مقررہ حدود سے باہر نکلنے کا پروگرام بنایا۔ یعنی امرتسر میں چلنے پھرنے کے لیے پاکستانیوں کے لیے ایک دائرہ مقرر تھا کہ وہ اسٹیشن سے باہر نہیں جاسکتے۔ اور اس کو یقینی بنانے کے لیے وہاں راء کے جاسوس موجود تھے۔ رفیق ڈوگر صاحب کے ایک ہمراہی شریف کنجاہی صاحب بڑے بے چین تھے۔ ان سے وجہ دریافت کرنے پر رفیق ڈوگر صاحب کو معلوم ہوا کہ انکے پاس ڈاکٹر کرنیل سنگھ کا ٹیلی فون نمبر نہیں ۔ کرنیل سنگھ امرتسر گورونانک پنجابی یونی ورسٹی کے پنجابی شعبے کے سکھ پروفیسر تھے۔

اس کے بعد رفیق ڈوگر صاحب کرنیل سنگھ سے اپنی ایک لفظی جھڑپ کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جب وہ مسز اندرا گاندھی کے دور میں پاکستان آئے تھے تو ان کے چند سوالات کرنے پر سنگھ صاحب برانگیختہ ہو گئے اور ادھر ترقی پسندوں نے بھی رفیق ڈوگر صاحب کی مخالفت شروع کر دی اور مجلس جہاں انہیں مدوع کیا گیا تھا وہیں برخاست ہو گئی ۔ اور ہندوستان واپس جانے کے بعد کرنیل سنگھ نے رفیق ڈوگر صاحب کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد امرتسر سٹیشن پر ڈاکٹر کرنیل سنگھ سے ملاقات ہونے کا تاج اور کچھ سیاسی بلیغ اشارے ہیں جن کو فکری باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا ۔ اس کے بعد ایک بھرپور رومانوی انداز میں ٹرین کے سفر کی داستان ہے جس میں رفیق ڈوگر صاحب ایک نہایت گہرے اسلوب کے ساتھ سفر کی روداد بیان کرتے ہیں۔ اس روداد کے درمیان وہ روتے بھی ہیں ہنستے بھی ہیں اور تلخ مگر حقیقت سے بھرپور جملے بھی بولتے ہیں۔

"میں اس وقت تک کھڑکی سے باہر جھانکتا رہا جب تک نیند کے جارحانہ حملوں کے سامنے ساتھیوں نے سپر نہ ڈال دی۔"4

کتاب کا پانچواں باب " وہی منزل وہی راستے " دہلی میں داخلے کی روداد ہے ۔ اس باب کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کوئی افسانہ پڑھ رہا ہو۔ ایک بھرپور رومانوی انداز میں عمرانی اور سیاسی مسائل کو ماضی کے ساتھ منسلک کرکے واحد متکلم کی صورت میں اسلوب کو نمایاں کیا گیا ہے۔رفیق ڈوگر صاحب پرانی دلی کے پرانے ریلوے اسٹیشن پر اترے وہاں ان کا استقبال بقول ان کے اس وقت کے سب سے متنازع سجادہ نشین جناب امام ضامن نظامی نے کیا۔رفیق ڈوگر صاحب بتاتے ہیں کہ اسٹیشن سے بسوں تک پہنچنے کے لیے جابجا قومی نعرے لکھے ہوئے انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا یہی ہو بہو نعرے انہیں امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر بھی دیکھنے کو ملے تھے جو تھے " Be indian buy indian"۔ اس کے علاوہ انہوں نے جا بجا دیواروں پر "سکھ ایک قوم ہیں" لکھا ہوا دیکھا اور ساتھ سکھوں کو درپیش مسائل کا حل بھی دیواروں پر ہی لکھا پایا یعنی خالستان۔ آزاد پنتھ ۔ ازاد ننکانہ۔ اس کے بعد سکھوں کے متعلق وہ اپنی ایک رائے پیش کرتے ہیں:

"قومی خصوصیات موجود ہونے کے باوجود قومی غلامی کا سبب خالصوں کا تاریخی جذبہ خدمت ہے

سکھ بڑی دلچسپ فرماں بردار اور بہادر قوم ہے۔ بشرطیکہ مد مقابل خالی ہاتھ ہو۔ 1947 ء میں جہاں جہاں مسلمان انھیں خالی ہاتھ ملے سکھوں نے اپنی بہادری کا عورتوں اور معصوم بچوں تک سے لوہا منوایا تھا۔ معصوم بچوں کو لوہے کی تلواروں اور نیزوں پر اچھال اچھال کر لوہا منواتے تھے۔ بھارت کی فوج اور انتظامیہ بڑی محنت اور احتیاط سے مسلمانوں کو نہتے کیا کرتے تھے تاکہ سکھ اپنی بہادری کا مظاہرہ کر سکیں"5

اس کے بعد رفیق ڈوگر صاحب بتاتے ہیں کہ دلی کی خوابیدہ سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی بس ایک وسیع میدان میں آ کر رکی جہاں مہرولی کا اسسٹنٹ کمشنر ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ دیوار کے ایک حصے کی فصیل ابھی باقی تھی ۔ یہ مقبرہ ہمایوں تھا۔ رفیق ڈوگر صاحب علامتی انداز میں کہتے ہیں مقبرہ بند تھا جس طرح اس مقبرے نے بہادر شاہ ظفر کو بھی پناہ نہ دی اور نا 1947 ء میں جان بچاتے بھاگتے ہوے مسلمانوں کو پناہ دیکر مدد کی۔

"کسی قوم کی تاریخ کے کھنڈر اسے پناہ دے سکیں یا نہ دے سکیں قومیں مصیبت کے وقت رخ انہی کھنڈروں کا کرتی ہیں "6

کتاب کا چھیواں باب " دھوپ اور سائے" درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کی حاضری کے گرد رومانوی امداز میں گردش کرتا ہے ۔ مقبرہ ہمایوں سے تقریباً دو کلومیٹر دور دہلی شہر اور بستی نظام الدین واقع ہے۔ مصنف کے لیے یہ دو تین کلومیٹر صدیوں کی مسافت بن جاتے ہیں وہ اپنے ماضی کی شان و شوکت اور تخت و شہنشاہی کو یاد کرتا ہے اور روتا ہے ۔ مصنف اس باب میں بہت زیادہ رومانوی ہوجاتا ہے جس کا تذکرہ ہم آگے فنی جائزے میں تفصیل کے ساتھ کریں گے ۔ رفیق ڈوگر کے سفرنامے میں جذبات کے ساتھ ساتھ ہمیں تاریخ کا تڑکا بھی نظر آتا ہے ۔ وہ اپنے قاری کو ہر حوالے سے سیر کرتے اور اسکی معلومات و فکر میں اضافہ کرتے ہیں ۔ درگاہ نظام الدین اولیاء کی تعمیر و ترقی کے متعلق درج ذیل افادی معلومات فراہم کرتے ہیں:

"شیخ کے مزار کی تعمیر و تکمیل میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا ہے ۔ خلجی دور کے محجر پر اکبری دور میں سید فریدوں شاہ نے مزار کے گرد ستونوں پر گنبد اٹھوایا اور سنگ مرمر کی حسین جالیاں لگوائیں دور جہانگیری میں فرید آباد کے بانی فرید خاں نے مزار پر سیپ کا نفیس اور چھپر کھٹ چڑھوایا۔ اس چھپر کھٹ پر شعر کندہ ہیں۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی نے شیخ کی مدح میں خود شعر کہے اور سنگ مرمر پر کندہ کرا کے مزار کی مغربی سمت پائنتی میں لگوائے ۔ اس نے امید ظاہر کی تھی۔

تاج شاہی ہند کا دیا ہے مجھ کو عنقریب

اسے ہند کا تاج تو مل گیا لیکن شاہی نہ مل سکی ۔ کاش وہ شاہی بھی مانگ لیتا۔ شاہ جہان کے عہد حکومت میں خلیل اللہ خاں نے مزار کے گرد سنگ سرخ کی غلام گردش بنوائی ۔ نواب احمد خاں والی فیروزپور جھنکہ نے سنگ سرخ کی غلام گردش سنگ مرمر سے بدل دی ۔ فیض اللہ خان بنگش نے سنگ سرخ کی چھت کے نیچے تانبے کی چھت جڑوا دی جس پر لاجوردی اور سنہری کام کیا ہوا ہے ۔ چونے کے برج کی جگہ سنگ مرمر کا برج اکبر شاہ ثانی نے بنوایا تھا۔ درگاہ کے پورے احاطہ میں سنگ مرمر کا فرش محمد شاہ بادشاہ نے ڈلوایا ۔"7

اس کے علاؤہ درگاہ میں سجادہ نشین کی سرد جنگ اور مزار مرید خاص امیر خسرو کا تذکرہ بھی اس باب میں ملتا ہے ۔ کتاب کا ساتواں باب " ہوئی مدت کہ غالب مرگیا" ہے ۔ نام سے ہی ظاہر ہے یہ مزار غالب پر حاضری کی روداد پر مشتمل ہوگا۔ غالب کا مزار حضرت نظام الدین اولیاء کے پڑوس میں واقع ہے ۔ یہاں رفیق ڈوگر ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں جس کا ذکر آئندہ فکری باب میں ہوگا۔

مزار غالب پر حاضری دیتے ہوے رفیق ڈوگر صاحب کو 64 ستونوں والی ایک مزید سنگ مر مر کی چھتری نظر آتی ہے۔ قریب جانے سے عقدہ کھلتا ہے کہ یہ قبریں مغل اعظم کے رضائی بھائی مرزا عزیز کوکلتاش اور ان کی آل کی ہیں۔ پھر غالب اکیڈمی جو غالب مرحوم کے پڑوس میں واقع ہے مصنف ادھر جاتا ۔ پر وہ بند ہوتی ہے ۔ کتاب کا آٹھواں باب" مکھیوں کا انتقام" ہے ۔ یہ سارا باب خوبصورت منظر کشیوں پر مشتمل ہے۔ کہانی اس باب کی دلی سے دو کوس دور مقبرہ ہمایوں پر حاضری سے آگے بڑھتی ہے ۔ وہاں شہد کی مکھیوں کا چھتہ آپے سے باہر ہوجاتا ہے جس سبب مصنف سمیت دیگر پاکستانیوں اور انگریز سیاحوں کو مقبرہ کا احاطہ چھوڑ کر باہر باغ میں بھاگنا پڑ جاتا ہے ۔ مصنف کا اسلوب دوران روداد مقبرہء ہمایوں بڑا رومانوی رہتا ہے ۔ کہیں کہیں اسلوب کاٹ دار ہوجاتا ہے ۔ ناواں باب " سیاہ حاشیے" جامع مسجد دہلی میں نماز ادا کرنے کی روداد ہے ۔

مصنف جامع مسجد کی تاریخ بڑے خوبصورت و دلنشیں انداز میں زہن نشین کرواتا ہے ۔ وہ بتاتا ہے کہ اس مسجد کے معمار شہاب الدین محمد شاہجہاں نے جامع مسجد دلی کی تعمیر اس زمانے میں دس لاکھ روپیہ کی لاگت سے بنوائی ۔ (ص 87)اس کے بعد مصنف مسجد کے ساتھ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد فاتحین نے جو سلوک کیا وہ ہمیں بتاتا ہے ۔ مصنف بتاتا ہے کہ جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسجد کو پانچ سال کے لیے بند کردیا گیا تھا ۔ اور بعد میں پانچ سال بعد مسجد مسلمانوں کے حوالے کی گئ تو شرط رکھی کہ اب نماز بعد کوئی مسجد میں نہیں رہے گا 2) ہندو بلا مزاحمت مسجد میں آ سکیں گے 3) سول اور فوجی حکام مسجد کے اندر آنے کے مجاز ہوں گے ۔ انھیں جوتے اتارنے کی ضرورت نہیں ۔

امید ہے وہ کتے ساتھ نہیں لائیں گے اور مسجد میں سگریٹ نہیں پئیں گے ۔ 4) دروازوں پر مسلح پہرے دار ہوں گے جن کی تنخواہ مسجد کمیٹی دے گی 5) مسجد کے بارے میں مقدمے اور جھگڑے کا فیصلہ حکومت خود کرے گی8۔ظہر کی نماز کے بعد مصنف مسجد کے مینار کی بلندی سے ٹکٹ خرید کر شہر دہلی کا نظارہ کرتا ہے ۔ جہاں اسے لاہور کی یاد آجاتی ہے ۔

اسکے بعد مصنف روزنامہ دعوت دلی کے ایڈیٹر محمد مسلم سے ملنے انکے گھر جاتا ہے ۔ واپسی پر محمد مسلم کے بھائی رفیق ڈوگر کی اعجنیت کے خیال سے گائیڈ کے حثیت سے انہیں واپس جامع مسجد لاتے ہیں ۔ دسواں باب " امام بخاری سے ملاقات" نام سے عیاں ہے خطیب جامع مسجد دہلی سے ملاقات کی کہانی ہے ۔ امام بخاری اندرا گاندھی کی آمریت کے سامنے ڈٹ گئے اور اقلیت کے حقوق کے تحفظ میں انہوں نے بہت ساری خدمات سر انجام دیں۔ امام بخاری ایک سادہ وضع قطع کے امام تھے مگر انہوں نے 1974 میں جو مظلوم ملت کے نام سے منشور حکومت کو پیش کیا تھا اس پر ڈٹے ہوئے تھے اور لڑ رہے تھے ۔ امام بخاری کا پہلا دیدار مصنف کے دل میں کچھ یوں تاثرات پیدا کرتا ہے۔:

"اچانک نظریں ایک طرف کو اٹھیں، نمازی اور بھی مؤدب ہوکر بیٹھ گئے، دراز قد، بھاری جسم، ڈھلتی ہوئی عمر ، بلاکریز کے کھلے پجامے اور کرتے میں ملبوس، سفید داڑھی والا ایک شخص کھونٹی ٹیکتا ہوا نہایت بے نیازی سے چلا سے آرہا تھا۔ پاؤں میں پرانی سی ہوائی چپل اور گلے میں پٹکا۔ وہ صفوں کے درمیان سے گزرتا ہوا جائے نماز تک پہنچا اور چپل نکال کر جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان نے مائیک سیدھا کیا اور لوگ اپنی اپنی جگہ ادب اور خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ چھوٹی سورتیں ، میانہ سجدے اور معتدل قیام ۔ سلام سے فارغ ہو کر اس نے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور دُعا ختم کر کے چپل پہن کر جدھر سے آیا تھا اُدھر چل دیا۔"9

اس کے بعد امام بخاری سے ان کا ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پرتبادلہ خیال ہوتا ہے جسے فکری باب میں وضاحت سے بیان کیا جائے گا ۔ گیارہواں باب " بھارتی قوم کی جبری تشکیل" ہے ۔ نام سے علامتی انداز ظاہر ہے یعنی کل ہندوستانی قوموں پر ہندو قوم کی برتری منوانا نیز انکو سیکولر اور ملحد بناکر بھارت ماتا کے پلیٹ فارم پر جمع کرنا۔

پروفیسر رشید مصنف کا زائر ساتھی اور مصنف دلی یونیورسٹی میں سلیبس جاننے کی غرض سے جاتے ہیں مگر ڈپٹی رجسٹرار بھارتی قوم کی تشکیل میں یونیورسٹی کی خدمات کی رپورٹ دینے جاتا ہے اور کئ گھنٹوں کہ بعد بھی واپس نہیں آتا ۔

مصنف یونیورسٹی میں لڑکیوں کی حالت اور کپڑوں کی عریانی پر حیران ہوتا ہے ۔ مصنف کو امرتسر پلیٹ فارم کی دیواروں سے لیکر دلی یونیورسٹی میں قومی تشکیل کے نعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بھارت ، بھارتی ایک قوم ہیں کا نعرہ تشکیل دینے میں بڑی سر توڑ کوشش کر رہا ہے مگر جانبداری یہاں بھی نمایاں تھی۔بارہواں باب " قلعہ معلیٰ پر حملہ" دہلی کے لال قلعہ کی سیر کی کہانی ہے۔ اس باب میں عروج و زوال کا مرثیائی انداز میں احاطہ کیا گیا ہے ۔ بلکہ مصنف کا کل سفرنامہ ہی قوم کی عروج و زوال کی داستان کے گرد گردش کھاتا ہے۔ مصنف کو دیوان عام کی شوکت اور دیوان خاص میں جہانگیر کا جلال اور بہادر شاہ ظفر کی مظلومی و گرفتاری آبدیدہ کردیتی ہے ۔

مصنف یہان کئ حکیمانہ مقولے کہہ جاتا ہے جو جلی حروف سے لکھ کر شاہراہوں پر لٹکائے جانے کے متقاضی ہیں۔ تیرہویں باب " اجنبی" میں اردو بازار دہلی جہاں اردو کم ہندی زبان زیادہ اور ہندوں تاجروں کا ذیادہ غلبہ ہے میں چہل قدمی کے بعد روزنامہ دعوت کے دفتر جانے کی کہانی بیان کی گئ ہے ۔ اس باب میں مسلمانوں کے حالات ہندوستان میں بھی زیر بحث آتے ہیں ۔ چودہویں باب " چپے چپے میں" درگاہ نظام الدین اولیاء پر چادر چڑھا کر شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی قبر پر جانے کی کہانی ہے ۔ شاہ ولی اللہ کی قبر پر حاضری کے دوران رستے میں ٹیکسی والا اور قبرستان کے باہر لگا سائن بورڈ بڑے عجیب و غریب قسم کے حقائق منکشف کرتا ہے ۔ یہاں ایک زائر کی کیفیت جو تاثرات و مشاہدات پر مبنی ہے کا اندراج بےجا نہ ہوگا:

"قبرستان سے باہر نکلے تو ایک زائر نے کہا:

ہمارے بزرگوں نے پاکستان بنا کر اچھا ہی کیا تھا۔ اس وقت ہم کہتے تھے اکٹھے بھی رہتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔عطا الحق قاسمی نے بھارت سے واپسی پر تجویز کیا تھا:پاکستان کے جملہ مخالفوں کو باری باری بھارت بھیجنا چاہیے وہ بہت اچھے پاکستانی بن کر واپس آئیں گے" 10

پندرہویں باب " اندرا کی تلاش میں " مصنف کا روڈ پر مارا مارا پھرنا اور اندرا کا دفتر تلاش کرکے انکا انٹرویو کرنے کی داستانِ دل نواز ہے۔ اس باب میں ہندو افسر شاہی کا مزاج بڑی وضاحت سے بیان ہوا ہے ۔ کہ غریبوں کو حکومت گھر الاٹ کرتی تھی جبکہ کوئی آفسر آکر انکو نکال دیتا تھا ۔ حکومت غریبوں کو زمینیں فراہم کرتی تھی مگر اندرا گاندھی کو لوگ آکر بتاتے تھے کہ انسے زمینیں چھینی جا رہی ہیں ۔ سولہویں باب " وقت کی آواز" میں ایک علامت ہے ۔ سارا باب حسین جیسے ہندوستانی مسلمانوں کے ہندوستان سے فرار اور حالات کے گرد گھومتا ہے ۔ وقت کی آواز سے مراد مسلمانانِ ہند کی غفلت ہے جنہوں نے وقت کی آواز پر کان نہ دھرا اور ہندو اکثریت کے ساتھ رہنا پسند کیا ۔ اور یہی حال پاکستانیوں کا تھا جنہوں نے ملک تو بنا لیا مگر وقت کی آواز نہ سنی اور دو ٹوٹے کروا لیا۔

سترہویں باب " بے گناہ قیدی" میں مصنف ، شریف کنجاہی کے جامعہ ملیہ سے واپس لوٹنے کی روداد بیان کرتے ہیں کہ جب وہ جامعہ سے واپس آئے تو بتاتے ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں کو مل کے لگا جیسے وہ کسی قید میں مبتلا ہوں۔ اٹھارویں باب " پنجابیوں کی لوٹ کھسوٹ" میں دلی کی عمومی ذہنیت کو بیان کیا گیا ہے۔ دلی والے لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ پنجابی دلی کا سارا سرمایہ لوٹ رہے ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ وہاں پنجابیوں کا کاروبار پر چھایا ہونا ہے۔مصنف بتاتا ہے کہ اسے ہر جگہ پہ سکھ ہی سکھ نظر آتے جو ہر روزگار پر چھائے ہوئے ہیں۔

" دلی کی سڑکوں پر دوڑنے پھرنے والی ٹریفک پر پنجابیوں کا مکمل قبضہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ڈرائیور سکھ، کلیز سکھ، ٹریفک پولیس کے افسر اکثر سکھ اور موٹر رکشا والے بالکل ہی سکھ۔" 11

انیسویں باب " سوئے آگرہ" کے نام سے ظاہر ہے یہ آگرہ جانے کی کہانی بیان کرتا ہے ۔ مصنف بتاتا ہے کہ ان کا ویزا صرف دلی تک محدود تھا مگر حکومت ہند انہیں اپنی پرائیویٹ گاڑیوں میں آگرہ لے جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور مصنف کے نزدیک رات اتنی خوشی اور بے تابی میں گزرتی ہے کہ ابراہیم لودی کو شکست دینے کے بعد بابر بھی آگرہ پہنچنے کے شوق میں اتنا بے چین نہیں سویا ہوگا۔آگرہ جانے والی سڑک مصنف کو خیالات کی دنیا میں گُما دیتی ہے اور مصنف کا اسلوب بڑا رومانوی ہو جاتا ہے۔اسی باب میں مصنف بتاتے ہیں کہ اگر میں داخلے سے قبل اکبر بادشاہ کی قبر بھی راستے میں پڑتی ہے جہاں ویرانی اور بندروں کا راج ہے۔ باب نمبر بیس " ادب گاہ محبت" تاج محل کی تلاش اور حاضری کا احاطہ کرتا ہے ۔ مصنف بتاتا ہے کہ تاج محل میں داخلے سے قبل ایک بڑی سی عرب سرائے سے گزرنا پڑتا ہے ۔ جیسے جہانگیر کے مقبرے سے پہلے اکبری سرائے پڑتی ہے ۔تاج محل کو دیکھ کر مصنف کے جذبات جس قدر ہیجان کا شکار ہوتے ہیں اگر میں ان کا بیان نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔

"تاج محل دریائے جمنا کے پانیوں کو آئینہ دکھاتی اس سفید عمارت کا نام نہیں جس کے اندر ممتاز محل اور شاہجہان کے جسد خاکی مدفون ہیں۔ جس کی تصاویر تاج محل کے نام پر دیکھی اور دکھائی جاتی ہیں۔ یہ عمارت تاج محل کا طرح مصرع ہے۔ اس سے تاج محل کے مجموعی حسن کا اندازہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے مقطع عرض کر کے پوری غزل کے حسن و خوبی کی داد طلب کرنا ۔ کاروان سرائے باغ کے فلک بوس عظیم الشان دروازوں ، کئی ایکڑ میں پھیلے ہوئے پھولوں کے تختوں، ہرے بھرے درختوں، فواروں رواں دواں نہروں، مسجد، قرینہ مسجد اور فصیل باغ سے الگ کرکے اس عمارت کو دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے حسن کی دیوی کے جھومر سے دیوی کے حسن و جمال کا اندازہ کرنا۔ تاج محل کی زمینی تصویر میں اس قدر وسعت اور گہرائی ہے کہ کسی بھی کیمرے کی آنکھ اس کی سچی شبیہ نہیں بنا سکتی۔ اس حسن لازوال کا ٹھیک اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو دل کے شفاف آئینے پر چشم بینا کے کیمرے اور ذوق جمال کی فلیش گن کی مدد سے دماغ کے حساس پر دوں پر تصویرِ حسن محفوظ کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔" 12

اکیسویں باب " غریب الطبع آگرہ" میں آگرہ کے طرز تعمیر پر تاج محل کی چھاپ اور آگرہ کے مسلمانوں کا کمزور و نحیف البدن ہونا بیان کیا گیا ہے ۔ اس باب میں مصنف اس کوٹھری کو دیکھتا ہے جہان اورنگزیب عالمگیر نے شاہجہان کو داراشکوہ کی مدد کرنے پر قید کیا تھا۔ مصنف بتاتا ہے تاریخ میں ہم نے حبس زدہ کوٹھری پڑھ رکھا تھا مگر حقیقت میں وہ ایک سنگ مر مر کی حسین و جمیل وسیع عمارت تھی جس میں شاہجہان کو رکھا گیا تھا ۔ بائیسویں باب " مے خواری" میں مصنف ہندوستان میں کثرت شراب نوشی کے متعلق بتاتا ہے ۔ ڈیسائی حکومت نے جس رات علان کیا تھا کہ 12 بجے شراب پر پابندی لگ جائے گی ملک میں لوگوں نے ڈھول پیٹ پیٹ کر ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہوے آخری رات سرِ بازار و مے خانوں میں جام پر کام لڈھائے تھے۔ مصنف کو لاہور کے کچھ مقامات یاد آتے ہیں جہاں شراب پابندی کے باوجود باقاعدگی سے موجود رہتی ہے ۔ ان میں سے لاہور پریس کلب ایک تھا۔

" 1800ء کی واپسی" تیئیسواں باب ہے کتاب کا۔ مصنف کچھ ہندو اخبار نویسوں سے ملتا جو ماہرین امور سیاست تھے ۔ نہ صرف ملک بلکہ پاکستان ، بنگلہ دیش ، نیپال اور افغانستان کے حالات سے بھی بخوبی آگاہ و باخبر ۔ مصنف حیران ہوتا ہے دوسرے لوگ ہم میں کتنی گہری دلچسپی رکھتے ہیں ۔ باب نمبر چوبیس" جہاں دلی آباد تھا" قطب مینار کے دیدار اور مسجد قوت الاسلام میں حاضری کے گرد گھومتا ہے ۔ پچیسواں باب جمہوریت کی کمزور رسی کچھ سکھوں کے ساتھ جمہوریت پر بحث کے گرد گردِش کرتا آخر میں سکھ مان جاتے ہیں بحثیت قوم 1947 میں مسلمانوں کا قتل عام کرکے ہم نے غلطی کی ۔ ہم ہندوؤں کے بہکاوے میں آگئے تھے ۔ اور اب ہمیں نہ ہندو حکومت کچھ دے رہی ہے نہ پنجاب ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ آخری باب " اے آب رود گنگا" لاہور کی رومانوی واپسی کے سفر پر مشتمل ہے۔ مگر رفیق ڈوگر صاحب رومانیت کی شدت میں گرد و پیش سے بیگانہ نہیں ہوتے بلکہ وہ رومانویت اور فکر کے امتزاج سے اپنے اسلوب کے دھاگے بنتے ہیں ۔

حوالہ جات

1۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء، ص: 5

2۔ ایضاً ، ص:25

3۔ ایضاً ، ص:28

4۔ ایضاً ، ص:44

5۔ ایضاً ، ص:57

6۔ ایضاً ، ص:61

7، ایضاً ، ص:71

8۔ ایضاً ، ص: 86

9۔ ایضاً ، ص:93

10۔ایضاً ،ص: 136

11۔ایضاً ،ص:169

12۔ایضاً ،ص:187

ب)فنی جائزہ

رفیق ڈوگر صاحب اپنے سفر کے آغاز میں سفر کی صوبتیں رومانوی انداز میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اجنبی دیس کے سفر میں کوئی ہم زبان ساتھ ہو تو آدمی اپنا دکھ درد کہہ سکتا ہے۔ لیکن رفیق ڈوگر کے نزدیک اس سے سفری آزادی ختم ہو جاتی ہے ۔ آدمی کا طرز سفر متاثر ہوتا ہے ۔ اور پھر رفیق ڈوگر بڑے رومانوی انداز میں اپنی فکر کو جذبات و احساسات کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

" سفر کے دوران ماحول اور افراد کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا ہر کسی کا اپنا الگ طریقہ ہوتا ہے۔ آپ کسی چیز کو زیادہ گہرائی میں اتر کر دیکھنا چاہتے ہیں لیکن آپ کے ساتھی کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ۔ وہ کسی مقام پر رک جاتا ہے آپ وہاں سے جلد گزر جانا چاہتے ہیں۔ آپ راستے کے کسی پتھر میں سنگ ساز کے دست شفقت کی تحریریں اور لکیریں پڑھنا چاہتے ہیں لیکن آپ کا ساتھی اس بت پرستی کے خلاف ہے۔ کوئی کھنڈر آپ کو عمارت رفتہ کی عظمت کی داستان سنانا چاہتا ہے لیکن آپ کا ساتھی کھنڈرات کی زبان نہیں سمجھ سکتا ۔ سیر و سیاحت میں ذوقِ سیاحت کا اختلاف خشوع و خضوع کے مراحل تک رسائی میں حائل ہو جاتا ہے"1

درج بالا اقتباس سے رفیق ڈوگر کی حساس طبیعت اور متفکر کیفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ رفیق ڈوگر صرف بدنی سفر کا قائل نہیں ہے وہ ہر مادی سفر میں کچھ خیالی سفر بھی کرتا ہے بلکہ یوں کہنا نامناسب نہیں ہوگا وہ خیالی سفروں کو مادی سیور کے تناظر میں پیش کرتا ہے ۔ اپنے ارد گرد میں کھنڈرات کی زبان سے ناآشنا لوگوں کے ہجوم میں وہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ :

" میرے ساتھ صرف ایک آرزو چل رہی ہے ۔ آرزوئے سفر"2

وہ اپنی آرزو کو کسی بھی کم سواد ساتھی کی صحبت سے زیادہ عزیز رکھتا ہے ۔ رفیق ڈوگر ایک مصلح قومی کے حثیت سے اور ایک دانا و بزرگ شہری کی حثیت سے کچھ مقولے اور واردات قلبی نصحیت کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ رفیق ڈوگر کے سرمائے کی امین نسل ان حکیمانہ مقولات سے کچھ جہت قومی اور فکر قوم حاصل کرسکے ۔ سفر میں رفیق ڈوگر کم سامان رکھنا پسند کرتا ہے ۔ ان کے نزدیک سفر میں چند چیزیں ضروری ہیں اور وہ باطن کی آنکھ کا وا ہونا سب سے اہم سامان سفر سمجھتے ہیں ۔

"سفر زندگی کا ہو یا دلی کا مسافروں کو آنکھیں کان اور کھڑکیاں کھلی رکھنی چاہئیں۔ یہ کھڑکیاں بند کر دینے سے تازہ ہوا اور خیالات سے دامن تہی ہوتا رہتا ہے۔"3

معلوم ہوا وہ خیالات کے لیے قوت حاصل کرنے کے لیے کھڑکی کی سیٹ پسند کرتے ہیں اور ساتھ ہی وہ مطالعہ کی دعوت دیکر تاریخ سے رشتہ پیوستہ رکھنے کو بھی اہم سمجھتے ہیں ۔ رفیق ڈوگر کھڑکی کے اس پار بادشاہی مسجد کے مینار دیکھ کر تاریخ کے بحر میں غوطہ لگاتے ہیں اور کہیں کسی جزیرے میں خیالات ہی خیالات میں کھو جاتے ہیں مگر جب وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں تو انکو معلوم ہوتا ہے انکے ہمسفری زائر اپنی تاریخ اور اسکی باقیات سے غافل اور کاموں میں مشغول ہیں تو وہ ایک بزرگ دانشمند کی مانند مسافروں کی بے نیازی کا گلہ یوں کرتے ہیں:

"جو مسافر راستے کے اتنے بڑے اور اہم حقائق سے بھی بے پرواہ ہوں ان کا منزل آشنا ہو جانا تاریخ کے معجزوں میں شمار ہوتا رہا ہے"4

اب راوی کے شاہدرہ والے پل سے گزرتے ہوے انہیں خشک راوی آبدیدہ کردیتا ہے اور 1947ء کا قتل عام جس میں غیر مسلح مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا کے ساتھ بھارت کا پاکستانی پانیوں پر قبضہ تلخ کردیتا ہے اور وہ بڑے علامتی اور رومانوی انداز بیان کے ساتھ خشک پانیوں کی داستان اور 1947 کے قتل عام کو یوں بیان کرتے ہیں:

"شاہی قلعہ اور شہنشاہی مقبرہ کے درمیان میں کبھی راوی بہتا تھا آج اس کی گزرگاہ آرام فرما ہے ۔ اس گزرگاہ میں اب ریت کے ذرے چمکتے ہیں۔ کہتے ہیں جب پاکستان بنا تو دلی کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے۔ اس کے ہونٹوں کی سرخی شدت غم میں زرد پڑ گئی۔ اس نے پاکستان کے حامیوں کے خون سے ہونٹ سرخ کیے تو خون آشام دلی کے منہ کو خون لگ گیا۔ جب لاکھوں انسانوں کے خون سے بھی اس کی پیاس نہ بجھی تو وہ پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں کا پانی بھی پی گئی۔ ستلج، بیاس اور راوی کا پانی دلی پی گئی ان کی گذرگاہیں اور ریت پاکستان کے حصّے میں ہیں۔"5

کیا خوبصورت انداز بیان اور تاریخی شعور کو رومانویت کی تہہ میں لپیٹ کر پیش کیا گیا ہے ۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا :

"بھارت کی سرحد کے آغاز سے دہلی اور آگرہ تک اس مسافر کے لیے جو شے بھی جذباتی توجہ کی مستحق تھی وہ اس مسافر نے دیکھی۔ وہ اس پر کہیں رویا ، کہیں ہنسا ، کہیں متعجب ہوا اور کہیں حیرت زدہ اور معترض ، لیکن اس نے یہ سب کچھ قومی حوالے سے کیا "6

ہندوستان کا سفر رفیق ڈوگر کے لیے احساسات کا سفر ہے ۔ بلکہ یہ کیفیت ان کے تمام سفرناموں میں ہمیں نظر آتی ہے ۔ وہ جذبات اور احساسات کو تاریخی شعور کے ساتھ آمیز کرکے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ خود رقم طراز ہوتے ہیں کہ:

"شاہراہ اعظم صدیوں کے تاریخی اور جغرافیائی پش منظر کے ساتھ میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سفر میرے لیے احساسات کا سفر تھا۔ یہ تاریخ کا سفر تھا جو اس خطہ ارض کے جغرافیائی حقائق کو جنم دیتا رہا ہے ۔"7

اب چونکہ یہ رفیق ڈوگر کے لیے تاریخ کا سفر تھا لہذا وہ جگہ جگہ رومانویت اور تاریخیت کے امتزاج سے ایک علامتی اور پُر تاثیر اسلوب کو سفرنامے میں جگہ دیکر اسکے وجدانی ہونے کا احساس دلاتے ہیں ۔ شاہراہ اعظم کے رستے امرتسر جاتے ہوے وہ شاہراہِ اعظم کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

"قدآور درختوں میں بل کھاتی شاہراہ اعظم کے دونوں جانب فصلیں ہی فصلیں تھیں۔ پھر بھی معلوم نہیں کیوں میں سوچ رہا تھا۔' نہ جانے اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں '۔ محمود غزنوی ، شہاب الدین غوری، ظہیر الدین بابر، شیر شاہ سوری ، نصیر الدین ہمایوں، جہانگیر، شاہجہاں ، اورنگ زیب عالمگیر اور پھر لٹے پٹے بھوکے ننگے، زخمی دم توڑتے ہوئے مسلمانوں کے قافلے ! سڑک کے دونوں طرف کے کنوؤں سے عفت مآب ماؤں اور بہنوں کی اُٹھنے والی چیخوں سے میرے کان پھٹنے لگے۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ نوے ہزار محافظین وطن کی سوئے وطن مارچ کی آواز پھر بھی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ بند آنکھوں کے سامنے کھڑی میری تاریخ پکار رہی تھی۔ آنکھیں اور کان بند کرکے تم مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے آنکھیں کھول کر میرا سامنا کرو۔ مجھے پہچانو۔ مجھ سے سبق حاصل کرو۔ والٹیر نے کہا تھا تاریخ انسانی حماقتوں ، بد نصیبیوں اور جرائم کا ریکارڈ ہے۔ میری قوم کی حماقتیں ، بدنصیبیاں اور جرائم میرے سامنے کھڑے تھے ۔"8

آپ نے درج بالا اقتباس سے رفیق ڈوگر کی حساس طبیعت کا خوبی کے ساتھ اندازہ لگایا ہوگا ۔ وہ جسمانی سفر کے ساتھ ساتھ روح کے سفر کے بھی قائل ہیں ۔ وہ اپنی قومی تاریخ کی غلطیوں پر رنجیدہ ہیں۔ وہ موجودہ نسل کی غفلت اور تاریخ سے بیگانگی پر جگہ جگہ آنسو بہاتے ہیں ۔جیسے کہ ہم گزشتہ سطور میں واضح کرچکے ہیں رفیق ڈوگر کی یہ دستان قومی درد و الم کے ساتھ سفری روداد کی مظہر ہے ۔ ان کا قافلہ مشرقی پنجاب میں جس جگہ بھی اترتا ہے انھیں یاد آجاتا ہے کہ 1947ء میں ہمارے ہزاروں قافلے یہاں لٹ چکے ہیں۔ وہ ہندوستان کے چپے چپے کو قومی روایت و تاریخ کے امین خطے کے طور پر دیکھتے ہیں اداس ہوتے ہیں اور گزر جاتے ہیں ۔ مگر وہ اس گزرنے کے تمل کے درمیان اپنے قاری کو تنہا نہیں چھوڑتے بلکہ جذبات کی فٹن میں سوار کرکے راسیں اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور گلیوں گلیوں کوچوں کوچوں ، بازاروں اور مسجدیوں میں قاری کو ساتھ لیے پھرتے ہیں ۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کیسے آج تک کچھ ہندو دل سے مسلمان ہیں مگر انکو جبری 1947 کی ہجرت میں ہندو بنا لیا گیا تھا ۔ اس کی وضاحت" فکری جائزہ "باب میں کی جائے گی ۔ ایک چیز کو رفیق ڈوگر صاحب کو جگہ جگہ ستاتی ہے وہ ہم فکر و ہم کیفیت ساتھی کے ساتھ کی کمی ہے ۔ وہ رہ رہ کر سرد آہیں بھرتے ہیں اور کہتے ہیں:

" سوچ کے سفر میں سفر کے ساتھی بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں" 9

لہذا ڈاکٹر سید عبداللہ نے درست فرمایا تھا کہ یہ ایک صحافی کی صرف صحافیانہ تحریر نہیں جس میں اخبار کے ذوق کا خیال رکھا گیا ہو بلکہ یہ روداد اذیت و غم اور اظہار لطیف احساسات و خیالات ہے ۔

"اب عرض یہ ہے کہ یہ کتاب" اے آب رود گنگا" ، دیر تک میرے پاس پڑی رہی اور میں اسے ایک اخبار نویس کی محض صحافیانہ کتاب سمجھ کر پڑھنے سے گریز کرتا رہا ۔ اگرچہ میں یہ جانتا تھا کہ اس میں اور کچھ نہیں تو رفیق ڈوگر کا خفی طنز اور چھیڑ چھاڑ کا تعریض آمیز لہجہ تو ضرور ہوگا جو ایک سنجیدہ قاری کو بھی محظوظ کر دیتا ہے مگر میں دیر تک اسے ٹالتا رہا ۔ آخر کار ڈر کے مارے جب کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو عجیب چیز تھی اور افسوس ہوا کہ میں نے اسے پہلے کیوں نہ پڑھا ، بلکہ بار بار کیوں نہ پڑھا ۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اس میں معمول کے سفرناموں کی سی بات کم سے کم ہے ، یہ تو پاکستانی تاریخ کے محقق کی سنجیدہ جستجوئے حقائق ہے جن سے پاکستان وجود میں آیا اور پھر اس کے حوالے سے بر صغیر میں اسلام کے شاندار ماضی پر ایک مطلب خیز تبصرہ ہے ، مطلب یہ کہ یہ سفرنامہ کم اور کتاب زیادہ ہے "10

ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ تبصرہ کس قدر بصیرت افروز اور حقائق پر مبنی ہے ۔ یہ ایک صحافی کی روداد نہیں بلکہ تاثیر سے اٹی ہوئی ایک داستان ماضی اور ترجمان باطن قسم کی نثر ہے ۔ اسکی ایک واضح مثال رفیق ڈوگر کا امرتسر ریلوے اسٹیشن پر دوڑ کر ریل پر سوار ہونا اور آخری آبدیدہ نگاہ امرتسر کے در و دیوار پر ڈالنے سے ہمیں مل جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

" گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنا شروع ہو گئی تھی ہم بھاگ کر اپنے معینہ ڈبے میں سوار ہو گئے اور کھڑکی سے سر نکال کر در و دیوار پر حسرت کی نظر کرنے لگے یا در و دیوار کو حسرت کی نذر کرنے لگے۔ اس شہر سے میری کوئی ذاتی یا خاندانی یاد وابستہ نہیں لیکن میری قوم کی اس سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ اس کی عبادت گاہیں ، مسلمانوں کی عمارات اور مزارات کے سنگ و خشت سے تعمیر کی گئی تھیں ۔ اس کی عبادت گاہوں اور بازاروں میں اس قوم کے خون کے نشان موجود ہیں، لمحات کی تہہ بہ تہہ گرد کے نیچے وہ خون جو پاکستان کی خاطر دیا اور لیا گیا۔ ان معصوم بچوں ، بے گناہ عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کا خون جن کا اس کے علاوہ کوئی جرم نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور پاکستان کا مطالبہ کرتے تھے " 11

تنہائی اور کھڑکی کی سیٹ رفیق ڈوگر صاحب کو نہایت مرغوب ہے۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوے اکثر خیالات کی دنیا میں کھو جاتے ہیں :

"روح جسم کے قید خانے میں بے چین اور تخیل یادوں کے ویرانوں میں' ماضی کے فسانوں میں۔ کھڑکی سے گردن نکالے، خاموش بیٹھا ایک ایک درخت، دیوار مکان کو دیکھ رہا تھا۔ مکانوں کے بعد باغ آئے اور پھر کھیتوں کی حدود میں داخل ہو گئے حدِ نظر تک لہلہاتی فصلوں پر آسمان سے مسلسل نور برس رہا تھا۔ قطار اندر قطار لہلہاتے گندم کے خوشے کھیتوں میں بکھرے ہوئے ' ٹیوب ویلوں پر چمکتے ہوئے بجلی کے قمقمے اور چاند کی روشنی میں نہائے چھوٹے موٹے گاؤں بڑا خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔"12

یہ رفیق ڈوگر کے سفرنامے کی خاصیت اور جزئیات نگاری کا ایک نمونہ ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسا بڑا نقاد بھی اس سفرنامے کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا ۔ کیا خوبصورت انداز میں سید عبداللہ نے اس سفرنامے کی ترجمانی کی ہے ۔ رفیق ڈوگر سفر میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کو توجہ دیتا ہے ۔ منظر نگاری میں اسے خاص نثر حاصل ہے ۔ مثلاً لکھتے ہیں:

'ہر پلیٹ فارم کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ خوانچہ والوں کی آوازوں کے زیر و بم ، ریڑھی والوں کا طرز سجاوٹ، گاہک پھنسانے کے حربے، لباس ، مسافروں کی دوڑ دھوپ ، بک اسٹالوں پر رکھا ہوا لٹریچر اور مقامی دستکاری کے نمونے ایک پلیٹ فارم کو دوسرے سے ممیز کرتے ہیں۔"13

درج بالا اقتباس رفیق ڈوگر کی منظر نگاری پر مہارت اور وسعت مشاہدات کی عمدہ مثال ہے۔ وہ سفر میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا نوٹس لیتے ہیں۔ ان کا وسعت مطالعہ اور وسعت مشاہدہ انکو دوسرے سفرنامہ نگاروں سے متمیز کرتا ہے ۔ اس کتاب کا اسلوب بیان خاص تاثیر رکھتا ہے ۔ پڑھنے سے فرحت اور راحت حاصل ہوتی ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص اس کتاب کو ایک عام قاری کی طرح ادبی دلچسپی کی خاطر ہی پڑھے گا اور سرگزشت قومی کے عبرت آموز واقعات کے درد سر سے بچ کر نکلنا چاہے گا تو بھی" اے آب رود گنگا " کو پڑھ کر اسے فرحت و راحت ہی حاصل ہوگی ، کیونکہ اس کا اسلوب بیان وہ خاص دلکشی رکھتا ہے جو رفیق ڈوگر کے قلم کے ساتھ مخصوص ہے ۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب یا سفرنامہ یا سرگزشت نامہ جو کچھ بھی اسے کہیے، خاصے کی چیز ہے اور ہر شخص کے پڑھنے لائق " 14

رفیق ڈوگر کی کتاب کے متعلق سید عبداللہ صاحب کا تبصرہ کس قدر جامع ہے ۔ اور سید عبداللہ صاحب کا فرمانا کہ یہ کتاب خاصے کی چیز ہے اور ہر شخص کے پڑھنے لائق بہت بڑی بات ہے ۔ ہمیں اس بات پر اور پھر رفیق ڈوگر کے سفرنامے پر ضرور توجہ دینی چاہیے ۔ رفیق ڈوگر کا سفرنامہ پڑھتے دوران کبھی کبھی افسانے کا تو کبھی ناول کا گمان ہوتا ہے ۔ وہ اس قدر خیالی سفر اختیار کرتے ہیں کہ کہانی کے اندر سے کہانی نکال لاتے ہیں ۔امرتسر سے دہلی پہنچنے کے بعد رفیق ڈوگر اور دوسرے زائرین کا قیام مقبرہ ہمایوں میں کیا جاتا ہے ۔ جہاں سے درگاہ کا فاصلہ دو تین کلومیٹر ہے۔ رفیق ڈوگر افراط و تفریط سے ہمیشہ بچ کر اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں ۔ ان کے اسلوب میں تاریخ ، مہذب طنز، سماجی شعور ، رومانویت ، حقیقت پسندی اور سادگی جیسے عناصر پائے جاتے ہیں ۔ درگاہ پر حاضری کے درمیان فقیروں کی فوج دیکھ کر اور ان کی حالت زار دیکھ کر مصنف کا اسلوب فوراً رومانوی سے عمرانی ہوجاتا ہے ۔ لکھتے ہیں:

" خدا کے نام پر اگر کوئی دینا بھی چاہتا تو بھائیوں کی کثرت کے خون سے ہاتھ جیب سے خالی نکال لیتا۔ کس کو دیں اور کس کو نہ دیں ایک سے دوسرا قابلِ رحم تھا اور دوسرے سے تیسرا قابل نذرانہ۔ نیم برہنہ، لاغر اور ناتواں جسم۔ زرد چہرے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں ۔ "15

اس اقتباس میں کثرت فقراء اور ان کی حالت کا جائزہ ہے جو رفیق ڈوگر کے سماجی شعور کا عکاس ہے۔ رفیق ڈوگر کو پورے دہلی میں سمجھ نہیں آتی یہاں کے لوگ اتنے کمزور و نحیف کیوں ہیں۔ مزار پر حاضری دیتے ہوے مصنف پر واضح ہوتا ہے خواجہ امیر خسرو کا مزار نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کے قدموں میں ہے۔ یہاں مصنف کا اسلوب حقیقت پسند رومانویت کا مظہر ہو جاتا ہے :

" خسرو دربار شاہی میں اونچی مسند پر بیٹھتا اور دربار اولیاء میں نیچی زمین پر۔ نیچی زمین نے اسے ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا ۔ اُونچی مسندوں کے اپنے نشان مٹ گئے ۔ آج کسی کو یہ بھی معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ وہ شاہ اور شہنشاہ کہاں دفن ہیں ۔خسرو آج بھی زندہ ہے کل بھی زندہ ہوگا۔ خسرو نے زندگانی کی حقیقت پائی تھی۔"16

کس قدر بلیغ یہ جملے ہیں اور کس قدر رومانوی حقیقت پسند مصنف کا اسلوب ہے ۔ مصنف نے اپنی ہستی مٹانے سے یعنی عاجزی سے بلند عہدے ملنے کا انکشاف کیا ہے ۔ رفیق ڈوگر کے سفرناموں میں آپ کو جابجا ایسی حقیقت پسند رومانویت سے سابقہ پڑے گا ۔ جو کہ ان کے ہم عصر لکھنے والوں میں مفقود تھی ۔ غالب کے مزار پر حاضری دیتے ہوے بھی مصنف حقیقت پسندی سے باز نہیں رہتا اور بتاتا ہے جب غالب کا مزار درگاہ نظام الدین سے منسلک کرنا تھا تو کئ چھوٹی چھوٹی قریبی قبروں کو ختم کردیا گیا اور اس پر غالب کے مزار کا صحن بچھایا گیا۔

"غالب کو درگاہ کے قریبی قبرستان میں عام لوں کی طرح عام قبروں کے درمیان میں دفن کیا گیا تھا۔ لیکن جب غالب کو لازوال بنانے کے لیے اس کی قبر پر چھتری تاننے کی ضرورت پیش آئی تو بقیہ تمام قبروں کو زوال آگیا۔ باقی سب کے نام و نشان مٹا دیے گئے۔ بڑے آدمیوں کے پڑوس میں چھوٹوں کی قبریں بھی غیر محفوظ ہوتی ہیں"17

کیسے سادگی کے ساتھ رومانوی اسلوب میں حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ بڑے آدمی کے پہلو میں چھوٹے کی قبر بھی غیر محفوظ ہوتی ہے کیسا بلیغ عمدہ اور تاریخی جملہ ہے ۔ اسی طرح مغل عہد کی قبروں پر قد آدم جھاڑیاں دیکھ کر مصنف رومانوی اور جذباتی سوال داغتا ہے :

" درجنوں قبریں اور قبروں کے ارد گرد جھاڑیاں اور گھاس ۔ یہ قد آدم گھاس کس کی عظمت رفتہ پر اگ آئی ہے ؟"18

آپ نے ملاحظہ فرمایا اسلوب میں کس قدر درد اور حقیقت ہے ۔ عظمت و دولت ایسی چیز ہے جو ہاتھوں کے میل کی مانند ہے ۔ نجانے وہ کب ختم ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کا اظہار مصنف نے رومانوی انداز میں کیا ہے ۔ ان کے اسلوب کا وطیرہ ایک حکیم بننا بھی ہے ۔ جسے حکیمانہ قول سوجھتے وقت دیر نہیں لگتی اور وہ اسے جھٹ سے بیان کردیتا ہے ۔ جیسے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے واضح فرمایا تھا یہ قومی الم و عبرت کی داستان ہے ۔ مصنف بھی انداز تعمیر سے زیادہ تاریخ کے انداز تخریب پر زیادہ غور و خوض کرتا دکھائی دیتا ہے ۔

"لوگ مقبرہ کا فن تعمیر دیکھنے آئے تھے اور ہم تاریخ کا انداز تخریب ، آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر جب لال قلعہ کی بلند و بالا فصیل کے اندر غیر محفوظ ہو گئے تو وہ اپنے احباب سمیت مقبرہ ہمایوں میں آبیٹھے تھے۔ جو بادشاہ قلعہ کی حفاظت نہ کر سکا مقبرہ اس کی کیا حفاظت کرتا ؟ افراد اور اقوام کے زوال کی جڑیں ان کی فکر میں پیوست ہوتی ہیں۔"19

مصنف کے کاٹ دار تلخ جملے اور تاریخی شعور داد کے قابل ہے ۔ وہ قومی درد میں مبتلا ہوکر اپنے بڑوں کی غلطیوں کو یاد کرتا ہے ان سے شکوے شکایات بھی کرتا ہے ۔ اسے سلطنت چھن جانے کا غم نہیں پر اسے معاشرے میں موجود بیگاڑ اور بے سمتی پر زیادہ تشویش ہے۔ اب مصنف کے اسلوب کی جانداری ملاحظہ کیجیے۔ مصنف مقبرہ ہمایوں کی یوں منظر نگاری کرے گا کہ پوری فلم آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے:

"یہ ایک مقبرہ ہے عجیب و غریب و نفیس و لطیف، شاہجہان آباد سے ڈھائی کوس پر جنوب کی طرف معز الدین کیفیاد کی کیلوکھتری کے سواد میں اور اس میں ہمایوں بادشاہ کی قبر ہے ۔ اور بھی بہت سی قبریں اس مقبرہ میں ہیں ۔ اس مقبرہ کی عمارت ایسی خوب ہے کہ روئے زمین پر اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ سنگ مرمر اور سنگ سرخ سے ملاکر اس کی عمارت بنائی ہے۔ سنگ مرمر تو وہ لطیف موتی کہ شہوار اس کے آگے دریائے خجالت میں ڈوب جاتا ہے اور سنگ سرخ وہ نادر کہ گلاب کی پنکھڑیوں پر شرف لے جاتا ہے۔ برج اس کا تمام سنگ مرمر کا گویا قدرت الٰہی کے دریا کا ایک موتی ہے۔ قطع اس برج کی ایسی خوب ہے کہ آسمان اس کی عظمت و شان سے اس کے آگے پانی کا بلبلہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خوش قطع برج روئے زمین پر نہیں ہے۔ چوڑان ، چکلان، اونچائی اس مقبرہ کی نہایت مناسب ہے۔ ایسی مناسبت کسی عمارت میں نہیں پائی جاتی جیسی اس میں ہے۔ با وصف اس عظمت کے ایسا نازک معلوم ہوتا ہے کہ جس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا ۔ صحن اس کا دلکشا اور مکانات اس کے دلربا ـــ وضع نہایت خوب اور قطع نہایت مرغوب ۔ سُرخ سُرخ پتھر میں سفید سفید دھاریاں عجب عالم دکھاتی ہیں۔ گل بوٹے رنگ برنگ کے پھر کے پھول پنکھڑیاں نئی نئی طرح کی اور ہی تاشے سے نظر آتی ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ باغ بہت آراستہ تھا۔ چاروں طرف نہریں جاری تھیں، جا بجا حوض بنے تھے، پانی لہراتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے بڑ کے درخت لگے ہوتے تھے۔ طرح طرح کے پھول کھل رہے تھے ، بلبلیں چہچہاتی تھیں اور اس کی خوبیاں جنت کی یاد دلاتی تھیں"20

آپ نے مصنف کے اسلوب اور موضوع پر گرفت کی مضبوطی کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ مسلمانوں کے حالات بھارت میں دیکھ کر مصنف ابوالکلام آزاد کو بھی کوستا دکھائی دیتا ہے ۔ بلکہ قومی درد میں ڈوب کر وہ خود کو بھی نہیں بخشتا ۔اس کی تفصیل فکری باب میں پیش کی جائے گی۔

رفیق ڈوگر طبعاً تنہائی پسند تھے ۔ جس سبب انکو سوچنے کا موقع ملتا ہے اور اپنے درد کو بیان کرنے کے لیے وہ ایک منفرد اسلوب کے بانی قرار پاتے ہیں ۔ جیسے دہلی کی ایک ویران سڑک پر چلتے چلتے وہ اپنے متعلق بتاتے ہیں کہ:

" سڑکیں ویران اور خاموش تھیں ۔ مجھے ویران اور خاموش سڑکیں اچھی لگتی ہیں ۔ میں دبے پاؤں ان ویران سڑکوں پر چلا جا رہا تھا"21

اور جب مصنف تنہائیوں میں مارا مارا اپنی فکر کی رہنمائی میں لال قلعے کی بلند فصیل کے قدموں میں پہنچتا ہے تو وہ اپنی قوم کی حماقتوں پر غصہ ہوجاتا ہے اور مصنف کا مطالعہ ، مشاہدہ اور حساس دل اسے ایک فلاسفر کی طرح اصولِ حکمرانی سمجھاتا ہے جیسے کہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ بلند بالا فصیل، یہ مضبوط قَلعہ اپنے مکینوں کی حفاظت کیوں نہ کر سکے۔ اس نے قلعہ معلیٰ کی طرف دیکھتے ہُوئے سوال کیا۔

"قلعے انسانوں کے نہیں انسان قلعوں کے محافظ ہوتے ہیں" میں نے لاہوری دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر وہ قلعے بناتے کیوں ہیں"

تاکہ بعد میں آنے والے ان کی اپنی مضبوطی اور کمزوری کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکیں"22

یہ سفرنامہ عروج و زوال کے فلسفے کی داستان اور قومی روایت کے زوال کا نوحہ اور ایک حساس دل کی مرثیاتی روداد ہے۔

ایک اور حکیمانہ مقولہ دیکھئیے۔ جب بیرون و اندرون ملک کے سیاہ غلط تاریخ گائیڈروں سے سن کر ہندوستانی قدیم عہد کی چیزیں خرید رہے ہوتے ہیں تو مصنف ان پر افسوس کا اظہار کرتے ہوے کہتا ہے:

" یہ زمانہ ثقافت اور آرٹ کا زمانہ ہے۔ سیاح ثقافت خریدتے ہیں تاریخ نہیں پڑھتے"23

کیسے عمدگی کے ساتھ سیکولر ذہنیت اور انسانوں کی گمراہیوں کے پردے کو بے نقاب کیا ہے۔ ایک اور حکیمانہ مقولہ یوں درج ہے:

"جو بندۂ خدا اپنے جیسے بندوں کے سر اپنے سامنے جھکے ہوئے دیکھنا پسند کرے، اس کا نہیں تو اس کی نسل کا سر لازما کسی دوسرے کے آگے جھک جاتا ہے۔"24

یہ سب مقولے درج کرنے کا مطلب رفیق ڈوگر کی شخصیت کی گہرائی کو واضح کرنا تھا ۔ان کی تنہائی ، مطالعہ اور قومی درد کیسے ان کے اسلوب کی تشکیل کرکے انہیں سب ہم عصر لکھنے والوں سے ممتاز کرتا ہے ۔ مصنف بھارت میں جگہ جگہ قومی تاریخ کے کھنڈرات پر آنسو بہاتا ہے ۔ اور مسلمانوں کے سیاسی و ذہنی زوال پر افسوس کرتا ہے ۔ حتیٰ کہ ان کے سفرنامے کے باب سولہ کا نام ہی وقت کی آواز ہے ۔ یہ نام استعارہ ہے ہندوستانی مسلمانوں کی غفلت کا۔

رفیق ڈوگر کے اسلوب میں مہذب طنز کی بھی چاشنی موجود ہے ۔ جب قلعہ معلیٰ پر ڈاکومنٹری دیکھنے کے لیے سب زائرین کو دعوت دی جاتی ہے تو مصنف بھانپ جاتا ہے کہ قلعے کی ایک نئی تاریخ لکھی گئی ہے اور انگریز کے تاریخ بگاڑنے کے ادھورے کام کو ہندوؤں نے آگے بڑھانے کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ لہذا وہ لکھتا ہے:

"قلعہ معلیٰ کی سرخ عمارتوں کے سیاہ سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ دیوان عام سے ذرا ہٹ کر پروگرام دیکھنے اور قلعہ کی داستانِ نو سننے کے لیے کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔"25

داستانِ نو کی اصطلاح پر غور کریں ۔ ایک مہذب طنز اپنے وجود میں لیے ہوے ہے۔ مصنف کا رومانوی اسلوب یہاں بھی برقرار رہتا ہے ۔ ڈاکومنٹری سن کر مصنف کو اندازہ ہوتا ہے بھارتی محقق اپنے نقطہء نظر کے مطابق مغلیہ تاریخ کو بیان کرتے ہیں ۔ یہاں سے آگے مصنف کا آگرہ کا سفر شروع ہوجاتا ہے اور جوں جوں آگرہ قریب آتا جا رہا ہے :

" سٹرک کے دونوں طرف مسلم آثار کے بقایا جات بڑھنے لگے۔ چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتوں کے بکھرے ہوئے اجزاء، سنگ ہائے میل ، اور مغلوں کے لائٹ ٹاور یہ قربت آگرہ کی نشانیاں تھیں"26

آگرہ میں داخلہ سے قبل اکبر کی قبر رستے میں پڑتی ہے ۔ وہاں قبر پر پہنچنے کے بعد مصنف اپنی ایک چوری کو بڑے دلکش اور مزاحیہ انداز میں چھپاتا ہے ۔ رفیق ڈوگر لکھتے ہیں:

"میدان کے بعد ہم ایک طویل اندھیرے ڈھلوان راستے سے ہوتے ہوتے اکبر کی قبر پر پہنچ گئے۔ مولانا مجاہد الحسینی نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو عارفین نے فاتحہ پڑھنے کی بجائے اس قبر پر کوئی نازیبا سی حرکت کرنے کا مشورہ دیا ۔ مولانا نے قبروں پر حاضری کے وقت کے بارے میں کوئی حدیث سنائی لیکن زائرین پر اس حدیث کا کوئی زیادہ اثر نہیں ہوا۔ مولانا کی امامت میں فاتحہ خوانی کرنے والے بہت کم نکلے۔ باقی قبر اور کمرۂ قبر کے معائنے میں مصروف رہے۔ میں بھی ان باقیوں میں شامل تھا۔"27

میں بھی ان باقیوں میں شامل تھا جیسے دلکش مصرعے پر غور کیجیے ۔ مصنف چوری کو مزاحیہ اسلوب میں چھپانے کی کوشش کر رہا ہے ۔تاج محل میں داخلے سے قبل ایک سرائے پڑتی ہے ۔ مصنف سرائے کی رومانوی توضیح اس انداز سے کرتا ہے:

"سرائے سے ہو کر مقبرہ میں جانا، اس بات کی یاد دہانی کے لیے تو نہیں کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے جو کوئی اپنا مال تجارت کے لیے لے کر آتا ہے اس میں چند روز قیام کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے دوسرے دروازے سے اگلی منزل کے لیے روانہ ہونا ہونا ہے"28

مصنف تاج محل کو دیکھ کر سکتے میں آجاتا ہے اور تاج محل کے متعلق ہماری معلومات میں اس طرح اضافہ کرتا ہے:

"تاج محل دریائے جمنا کے پانیوں کو آئینہ دکھاتی اس سفید عمارت کا نام نہیں جس کے اندر ممتاز محل اور شاہ جہان کے جسد خاکی مدفون ہیں۔ جس کی تصاویر تاج محل کے نام پر دیکھی اور دکھائی جاتی ہیں۔ یہ عمارت تاج محل کا طرح مصرع ہے۔ اس سے تاج محل کے مجموعی حسن کا اندازہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے مقطع عرض کر کے پوری غزل کے حسن و خوبی کی داد طلب کرنا ۔ کاروان سرائے باغ کے فلک بوس عظیم الشان دروازوں ، کئی ایکٹر میں پھیلے ہوئے پھولوں کے تختوں، ہرے بھرے درختوں، فواروں رواں دواں نہروں، مسجد، قرینہ مسجد اور فصیل باغ سے الگ کر کے اس عمارت کو دیکھنا ایسے ہی ہے، جیسے حسن کی دیوی کے جھومر سے دیوی کے حسن و جمال کا اندازہ کرنا۔ تاج محل کی زمینی تصویر میں اس قدر وسعت اور گہرائی ہے کہ کسی بھی کیمرے کی آنکھ اس کی سچی شبیہ نہیں بنا سکتی۔ اس حسن لازوال کا ٹھیک اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو دل کے شفاف آئینے پر چشمِ بینا کے کیمرے اور ذوق جمال کی فلیش گن کی مدد سے دماغ کے حساس پردوں پر تصویر حسن محفوظ کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔"29

آپ نے ملاحظہ فرمایا مصنف کا جذباتی اسلوب ، منظر نگاری اور رومانویت کیسے ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں اور مصنف کا اسلوب کیسے ہمارے دلوں میں تاثیر پیدا کرکے تاج محل دیکھنے کی حسرت اجاگر کرتا ہے ۔ ڈاکٹر انور سدید اس سفرنامے پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"اے آب رود گنگا میں رفیق ڈوگر نے ہندوستان کو ایک ایسے صحافی کی نظر سے دیکھا ہے جس کے دل میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ محفوظ ہے۔ اور اس کا مقصود اول محض مسافتیں طے کرنا نہیں بلکہ شوکتِ رفتہ کے نقوش تلاش کرنا ہے۔ اس کی چشمِ گریاں نے تاریخ کا دامن بھی تھاما اور مٹے ہوئے اوراق سے زندگی گزارنے کے نئے اصول بھی جمع کیے لیکن پورے ہندوستان میں اسے اپنا ایک بھی دوست نہ مل سکا۔ اس سفر نامے کا اسلوب تخلیقی ہے۔"30

اس اقتباس سے رفیق ڈوگر کی عظمت و اسلوب کی مزید شرح ہو گئ ہے ۔ رفیق ڈوگر ایک تخلیقی نفس تھا ۔ اس نے مٹتے ہوے نقوش کو نہ صرف دیکھا بلکہ ایک ماہر عمرانیات کی حثیت سے ان نقوش کے مٹنے کے اسباب پر تبصرہ بھی کیا ہے اور پھر ان عظمت رفتہ کے مٹتے نقوش سے زندگی گزارنے کے نئے نئے رستے بھی دکھائے ہیں ۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں رفیق ڈوگر کی برتری صرف واقعات کے بیان پر نہیں ہے بلکہ واقعات کو تاریخ ، ماضی اور رومانویت کے کاغذ میں لپیٹ کر پیش کرنا اور دلوں میں اپنی تخلیق سے تاثیر پیدا کرنا ان کے اسلوب کا خاصہ ہے ۔راج محل کے متعلق رفیق ڈوگر کے رومانوی اسلوب کا ایک اور اور عمدہ نمونہ اور مرقع دیکھئے:

"تاج محل کے حسن و جمال کا بیان ممکن نہیں۔ اس کوشش میں انسان اسی طرح ناکام رہے ہیں جس طرح سرخ گلاب کی نازک اندام بہتی پر سورج کی پاکیزہ کرنوں میں چمکتے قطرہ آب کے تجزیہء حسن میں انسانوں کو ناکامی ہی ناکامی ہوئی ہے۔ اس جگہ حسن محبت ، تقدس اور فن اپنے اپنے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ ایک شہنشاہ کی اپنی رفیقہ حیات سے بے داغ اور لازوال محبت کا لازوال شاہکار ہے۔"31

ڈاکٹر سید عبداللہ رومانیت کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"رومانیت کا ایک ڈھیلا سا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسے اسلوب اظہار یا اندازِ احساس کا اظہار کرتی ہے جس میں فکر کے مقابلے میں تخیل کی گرفت مضبوط ہو۔ رسم و روایت کی تقلید سے آزادی خیالات کو سیلاب کی طرح جدھر ان کا رخ ہو آزاد ڈے بہنے دیا جائے۔ یوں ہر انسان کے مزاج میں کچھ نہ کچھ رومانویت ضرور ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے لئے ایک خیالی دنیا بساتا ہے اور اندر ہی اندر اس کی تکمیل کا آرزو مند رہتا ہے ۔ اس کے پورا نہ ہونے سے مغموم متفکر ہوتا ہے ۔ " 32

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے رفیق ڈوگر ایک حقیقی واقع سے قوت محرکہ لیکر خیالات کی دنیا میں گُم ہو جاتے ہیں ۔ رفیق ڈوگر کی رومانویت مغربی یا افراط و تفریط میں نہیں ۔ وہ جذبات کے ساتھ ساتھ منطق اور حقیقت نگاری کا سہارا بھی لیتے ہیں ۔ یوں کہا جا سکتا ہے انکی رومانویت ایک مشرقی رومانویت ہے جو میں اعتدال ہے ۔ آگرہ میں ہی مصنف کے نماز کی ادائیگی کے بیان میں خیالات و حسن بیان کی آمیزش دیکھیں:

"عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ میں ایک ستون کے پاس نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈے فرش پر پیشانی رکھ کر میں سوچ رہا تھا نہ معلوم اس خاک میں کتنے اور کس کس کے سجدوں کے نشان پوشیدہ ہیں۔ محراب و منبر کب سے خاموش ہیں۔ سپین سے روس کماری تک جتنی مسجدیں بے اذان ہیں کسی اور مذہب کی اتنی زیادہ عبادت گاہیں خطہ زمین بر ویران نہیں ہوں گی "33

یہ ایک حساس طبیعت کے حامل نفس ناطقہ کا تبصرہ ہے۔ حزن و درد کی چادر پورے سفرنامہ میں مصنف پر پڑی رہتی ہے ۔ قطب مینار حاضری کا نظارہ ملاحظہ ہو:

"تاریخ کے جانے پہچانے راستوں سے ہوتا ہوا اہل تاریخ کے انجانے مسافروں کا قافلہ ایک نیم ویران جگہ پر رک گیا۔ باہر آئے تو قطب مینار سامنے کھڑا تھا۔ مسجد قوت الاسلام کی محرابیں صاف نظر آرہی تھیں۔ خیال ہوا کہ ہم مسجد اور مینار دیکھنے آئے ہیں۔ قافلہ سالار نے بتایا مسجد نہیں مزار چلنا ہے۔"34

مسجد قوت الاسلام دیکھ کر انکا دل آبدیدہ ہوجاتا ہے اور جذباتی و رومانوی انداز میں لکھتے ہیں:

"مسجد قوت الاسلام کے ماضی کی طرح اس کا حال بھی دلی میں اسلام کی قوت کا مظہر ہے۔ ٹوٹے پھوٹے درودیوار بے نشاں محراب و منبر ۔ ماضی جمال و جلال، حال خستہ حال ۔ واہ رے گردش زمانہ تیری بے نیازی جو تیرے ساتھ نہ چل سکے تو بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے"35

ملاحظہ کیجیے وہ مسجد قوت الاسلام سے زندگی گزارنے کا ایک قانون وضع کرتے ہیں ۔ جیسے کہ ہم گزشتہ سطور میں ذکر کر چکے ہیں کہ رفیق ڈوگر کی رومانویت معتدل ہے ۔ یا یوں کہیے مشرقی مزاج کے مطابق ہے ۔ وہ جذبات کی رو کے ساتھ گرد و پیش سے غافل نہیں ہوتے ہیں ۔ پاکستان واپسی پر اس چیز کا عملی نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

"اتنی بڑی کائنات میں میرا مقام اور پہچان چند درجن کچے گھروں اور گلیوں تک ہی محدود ہیں۔ میرا وجود پگھل گیا ۔ دوڑتی ہوئی گاڑی اور خوابیدہ انسانوں کے درمیان اکیلے بیٹھے مجھے خوف آنے لگا۔ میری ماں نے کہا تھا جب تم ڈر جاؤ تو کلمہ پڑھ لیا کرو۔ میں زیر لب کلمہ پڑھنے لگا۔ ریل گاڑی اسی رفتار سے دوڑی جا رہی تھی ۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ زمین پر دور دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ محسوس ہوتا تھا جہاں تک چاند کی روشنی پھیلی ہے سب کچھ میرا اپنا ہے۔ زمین ، فضائیں ، ہوائیں ، آسمان اور اس پر چمکنے والے چاند اور ستارے سب میرے اپنے ہیں۔

تاج محل آگره ، لال قلعہ دلی ، جامع مسجد، قطب مینار، مدينة الزهرا ، مسجد قرطبه، سمرقند و بخارا سب میرے ہیں"36

حوالہ جات

1۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء، ص:6

2۔ ایضاً ، ص:7

3۔ ایضاً ، ص:9

4۔ ایضاً ، ص:10

5۔ ایضاً

6۔سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، ادب و فن،لاہور ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، 1987ء، ص: 110

7۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء، ص:13

8۔ ایضاً ، ص:21

9۔ ایضاً ، ص:39

10۔سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، ادب و فن،لاہور ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، 1987ء، ص: 110

11۔ ایضاً ، ص:44

12۔ ایضاً

13۔ ایضاً ، ص:45

14۔سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، ادب و فن،لاہور ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، 1987ء، ص:111

15۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء، ص:65

16۔ ایضاً ، ص:67

17۔ ایضاً ، ص:75

18۔ ایضاً ، ص:76

19۔ ایضاً ، ص:81

20۔ ایضاً ، ص:81-80

21۔ ایضاً ، ص:105

22۔ ایضاً ، ص:115

23۔ ایضاً ، ص:119

24۔ ایضاً ، ص:121

25۔ ایضاً ، ص:159

26۔ ایضاً ، ص:179

27۔ ایضاً ، ص:181

28۔ ایضاً ، ص:186

29۔ ایضاً ، ص:187

30۔ انور سدید ، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ ، لاہور ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، ص:554

31۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء، ص:193

32۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر،مباحث، دہلی، کتب خانہ نذیریہ ، جلد دوم، ص: 93

33۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء، ص:201

34۔ ایضاً ، ص:216

35۔ ایضاً ، ص:219

36۔ ایضاً ، ص:240

پ)فکری جائزہ

رفیق ڈوگر کے سفرنامے کی فنی خوبیاں اور رومانوی داستانی اسلوب دیکھنے کے بعد اب ہم سفرنامے کا فکری جائزہ لیتے ہیں ۔ فکری جائزہ میں ہم دیکھے ہیں کہ مصنف کسی دبستان سے تعلق رکھے بغیر آزدانہ سوچ رہا ہے ۔ اور اس آزادی کی جڑیں حقیقت پسندی ، انسانیت کی خیر خواہی اور تاریخی حقائق میں پیوست ہیں ۔ رفیق ڈوگر نہ ترقی پسند ہے نہ مارکسسٹ ۔ بلکہ وہ انسانیت کی فلاح کے لیے اسلام اور اخلاق کو اہمیت دیتا ہے ۔ وہ ہندوستان میں اپنے ماضی کی تاریخ اور اس کا سیاسی زوال کو معروضی طور پر فکری جائزہ لیتا ہے ۔ پاکستانی حکومتوں کا وہ معروضی طور پر جائزہ لیتا ہے ۔

ہندوستانی حکومت کو وہ حقیقت پسندانہ جائزے کے تحت سخت ہاتھوں لیتا ہے ۔ اور اسکی دوغلی پالیسی اور اپنوں کی کمزور پالیسی پر دو پر طنز و حقائق کے نشتر چلاتا نظر آتا ہے ۔ یہ اس سفرنامے کی بڑی خوبی ہے کہ مصنف بیک وقت فکر و فنی دونوں سطحوں پر عمدگی کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ اور حقائق کو جیسے کہ وہ ہیں بیان کردیتا ہے اور اس چیز سے ضرور بحث کرتا ہے کہ حقائق کو کیسا نہیں ہونا چاہیے تھا اور کیسا ہونا چاہئے تھا ۔

رفیق ڈوگر سیاسی زوال کی داستان بیان کرتے کرتے جذبانی نہیں ہوجاتا ۔ بلکہ وہ اپنے ہواس و عقل کو قائم رکھتے ہوے زوال کا آبدیدہ نگاہی سے جائزہ لیتا ہے ۔ یعنی ایک اقتباس سے آپ چین اور پاکستان کے تعلقات کو یا امریکہ اور پاکستان کے تعلقات کو یا ہر بڑے ملک کے ساتھ چھوٹے ملک کے تعلقات کو کس قدر خوبی کے ساتھ سمجھ جاتے ہیں:

"چھوٹے ممالک کے دفاعی حصار بھی بڑے پڑوسیوں کے تجارتی مفادات کے بوجھ تلے ٹوٹ جاتے ہیں"1

کس قدر خوبصورت سیاسی اشارہ ہے مگر اسلوب دیکھیں کہیں بھی وہ جذباتی نہیں دکھائی دیتے۔ جب وہ شاہراہِ اعظم پر گامزن سفر ہوتے ہیں تو انہیں 1965 کی پاک بھارت جنگ یاد آجاتی ہے اور اس کا وہ فکری جائزہ یوں لیتے ہیں:

ان سڑکوں راستوں اور کھیتوں میں ہمارے عظیم دوست بھارت کے ٹینک اور توپیں پیامِ دوستی گھر گھر پہنچانے کے لیے دوڑتے اور دھاڑتے پھر رہے تھے۔ پھر جب کئی ماہ تک ہمارے مہمان رہ کر وہ اپنے گھروں کو واپس گئے تو اِس زمین کی ہر چیز اپنے ساتھ لے گئے۔ مکانوں کی چھتیں ، کھڑکیاں دروازے، اینٹیں ، سٹرکوں کے کنارے سے درخت اور کھیتوں سے ہریالی ۔ وہ اس خطہ زمین پر لوہے اور بارود کی توانا فصل چھوڑ گئے جس کو کاٹتے ہوئے سینکڑوں بچے جوان اور بوڑھے بھارت کے جذبہ دوستی کی نذر ہو گئے تھے ۔"2

آپ نے فکری گہرائی اور واقعات کو حقیقت کے ساتھ منسلک کرکے بیان کرنے کے حوالے سے رفیق ڈوگر کا اسلوب ملاحظہ فرمایا ۔ یہ وہی اسلوب ہے جو ایک درد مندِ قوم اپنی تہذیب کے عروج کی طرف اختیار کیے گئے سفر میں اختیار کرسکتا ہے ۔ مصنف کو عروج کے دنوں کے بعد اچانک یکایک ایسی پستی دیکھنے کو ملتی ہے جسے وہ پاکستانی سیاست و معاشرے سے منسلک کرکے بیان کرتا ہے ۔ جبکہ ہندوستانی مسلمانوں کا حال اسے مزید آبدیدہ کردیتا ہے ۔ کبھی وہ سیاست دانوں پر سفرنامے میں چوٹ کرتے ہیں تو کبھی اداروں پر ۔ خصوصاً ایل ڈی اے اور کارپوریشن جیسے ادارے مصنف کو ایسے ناسور اور بیماریاں لگتی ہیں جو لاہور ہو اندر ہی اندر سے کھا رہی ہوتی ہیں ۔

ہندوستان میں جابجا مصنف کو آر ایس ایس کی ذہنیت کے حامل لوگ دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے ۔ اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں کو کچہ کھا جانا چاہتے ہیں ۔ اسی احساس کے پیشِ نظر مصنف گاڑی سے باہر جھانک رہا ہوتا ہے تو اسے ننھے منے سے چند بچے سکول سے واپس جاتے دکھائی دیتے ہیں ۔ بچوں کو دیکھ کر وہ آبدیدہ ہوجاتا اور اس کا دل کرتا ہے کہ یہ بچے کبھی بڑے نہ ہوں ۔ کیا خبر بڑے ہوکر یہ میرے بچوں کو 1947 کی طرح پھر کرپانوں اور نیزوں کی انیوں سے مار کر پاکستان نہ بنا دیں۔ مصنف کہتا ہے اگر یہ بچے بچے ہی رہتے تو ایک دوسرے کو تھپڑ مار کر صلح کرلیتے مگر بدقسمتی سے وہ بڑے ہوگئے۔ اور پھر دونوں طرف انسان مرے ۔ مصنف لکھتا ہے:

"آئندہ لڑائیوں میں بھی دونوں طرف سے انسان مارے جائیں گے۔ کیا معلوم ان بچوں میں سے کون کس کو مارے گا! کون کس کے ہاتھوں مارا جائے گا ؟ ایسا کیوں ہے ؟ اس لیے کہ اُن کے والدین کو میری تاریخ پسند نہیں۔ انھیں اپنی تاریخ کا علم ہے۔ اپنی تاریخ انھیں اپنے بچوں سے زیادہ عزیز ہے۔

یہ بچے اپنی ملی تاریخ اور ملکی جغرافیہ کے لیے ہیں۔ ان کے بڑے اپنی تاریخ اور جغرافیہ کو سیدھا کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ ان پر فخر کر سکیں اور میرے بچے ان کی تاریخ اور جغرافیہ کی راہ میں بھاری رکاوٹ ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی قوم اپنی تاریخ اور جغرافیہ کی رکاوٹوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ خاص طور پر وہ قوم جسے اپنی بڑائی کا تازہ تازہ احساس ہوا ہو اور اس کا ماضی اس احساس کا ساتھ نہ دے سکے ۔ میرے والدین اُن کے والدین کی راہ میں رکاوٹ تھے کہ اُن کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ ان کا یہی جرم تھا۔ میرا بھی یہی جرم ہے۔ میرے بچوں اور ان کے بچوں کے بچوں کا بھی یہی ناقابل معافی مجرم ہوگا۔"3

رفیق ڈوگر صاحب کی یہی حقیقت پسندانہ خوبی ہے کہ وہ واقعات کا جائزہ موجودہ حقائق اور تاریخی واقعات کی روشنی میں لیتے ہیں ۔ وہ کہیں تعصب نہیں دکھاتے ۔ ان کا دل ایک حساس شاعر کے دل کی مانند ہے لہذا وہ ویران مسجدوں کو دیکھ کر ، مقبروں کو دیکھ کر اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر دل گرفتہ ہوجاتے ہیں اور واقعات کو حقائق کی روشنی میں رومانوی و فکری امتزاج کے ساتھ لکھ ڈالتے ہیں ۔ مصنف کا عمرانی شعور اور واقعات کی توضیح و تعبیر کرنے کی صلاحیت کو درج زیل اقتباس سے ملاحظہ فرمائیں:

"منحنی ٹانگوں والے نیم برہنہ خستہ حال بوڑھے انسانوں کو دہلی کی اونچی نیچی سٹرکوں پر موٹے موٹے پنڈتوں اور پنڈتانیوں کو کمر کے بل جھک جھک کر کھینچتے دیکھ کر کئی بار خیال آیا کہ بھارت اپنے کارخانوں میں ٹینک، توپیں اور تباہ کن طیارے اور بحری جہاز بنانے کے ساتھ ساتھ وافر مقدار میں موٹر رکشا کیوں نہیں بناتا! پھر خیال آتا اگر وہ ایسا کرے تو اس کے برہمنوں، پنڈتوں اور کھشتریوں کو انسان کی خدمت کا موقع کیسے ملے گا ؟ بھارتی حکومت نے اپنی خوشحال رعایا کو انسانی خدمت اور ہمدردی کا سستا اور آسان موقع فراہم کرنے کے لیے ہی آج تک بد حال رعایا کے لیے موٹر رکشا وافر مقدار میں نہیں بنائے"4

سائکل، گرمی اوپر موٹے پنڈتوں اور پنڈتانیوں کا بوجھ مصنف کا عمرانی شعور تلخ حقائق کو دیکھ کر تلخ اسلوب میں ڈھل گیا ہے ۔ وہ انسان کی ایسی تذلیل کا مذاق اڑاتا ہے ۔ اور تذلیل کو طنزیہ انداز میں بھارتی حکومت کی جانب سے خدمت قرار دیتا ہے ۔ اب ایک اور مثال سے مصنف کی حقیقت پسندی اور پاکستانی سیاستدانوں پر تنقید ملاحظہ فرمائیں:

"بھارت کے عوام کو بھٹو کی گرفتاری پسند نہیں۔ انھوں نے ہمیں خبردار کیا ۔

'شاید اس لیے کہ انھیں پاکستان میں عوام کا قتل عام پسند ہوتا ہے' ہم نے جواب

وہ ذرا دیرہ خاموش رہے پھر کچھ سوچ کر بولے :

آپ اس قتلِ عام کی وضاحت کریں گے ؟

جب آپ کا من پسند ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے عوام کا چڑیوں کی طرح شکار کر رہا تھا اس وقت تو وہ آپ کو نا پسند نہیں ہوگا؟"5

رفیق ڈوگر کا یہ سفرنامے ایک سفرناموں کی دنیا میں پیش رو کی حثیت اختیار کرسکتا ہے۔ یعنی فکری اور فنی دونوں حوالوں سے۔ کیسے واقعات کو حقائق کی روشنی میں مگر ادبی انداز میں بیان کیا جانا چاہیے سے لیکر رومانویت اور خارجیت کے امتزاج تک ہمیں تمام چیزیں رفیق ڈوگر کے ہاں مل جاتی ہیں۔ مصنف کا حقائق سے پردہ اٹھانے کا عمل پہلے صفحے سے لیکر آخر تک جاری رہتا ہے ۔ 1947 کے فسادات کے تناظر میں مصنف بیان کرتا ہے کہ :

"کسی گاؤں میں اگر کوئی ہندو ہمیں بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جائے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اندر سے ابھی تک مسلمان ہے۔ اُس کے آباء کو زبردستی ہندو بنا دیا گیا تھا۔ اگر ہم انھیں جان ومال کے تحفظ کی ضمانت دے سکیں تو وہ مسلمان ہونے کا اعلان کرنے کے لیے بھی تیار ہوتے ہیں ۔"6

یہاں مصنف پاکستانیوں سے ایک بھرپور شکوہ کرتا ہے کہ ہم لوگ ہندوستانی مسلمانوں کے حالات سے یکسر غافل ہیں۔ لاہور میں ترقی پسندوں پر چوٹ کا ایک بہت خوبصورت واقع سفرنامے میں درج ہے ۔ مصنف بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر کرنیل سنگھ ہندوستان سے پاکستان کلچر پر لیکچر دینے آئے اور انکے بقول سب پنجابی ایک ہیں ۔ پنجابی ، ہندوؤں ، سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ کوئی ایسا اہتمام کرنا چاہیے کہ سرحد کے دونوں جانب پنجابی ادیب ایک دوسرے کو پڑھ سکیں ۔ مگر جب مصنف چند سوال ڈاکٹر صاحب سے پوچھتا تو ترقی پسند کیسے ہنگامہ کھڑا کرتے ہیں خود ملاحظہ فرمائیں:

"اگر آپ سچ کہتے ہیں تو آپ کی پنجابی صوبے کی تحریک کی پنجابی ہندوؤں نے اتنی شدید مخالفت کیوں کی تھی اور پنجابی دشمنی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے نیا ہریانہ صوبہ کیوں بنوایا تھا ؟ رنجیت سنگھ کے دربار کی پنجابی زبان کا رسم الخط فارسی تھا ، آپ نے اسے چھوڑ کر گورمکھی لپی کیوں اپنایا ؟ آپ اس غلطی کا ازالہ کر دیجیے، رسم الخط میں بھائی چارے سے دونوں طرف کے ادیبوں کی ایک مشکل تو آسان ہو جائے گی ؟ 'میں نے کہا تھا ۔

مہمان خصوصی کے جواب دینے سے پہلے اُن کے میزبان خصوصی جناب شفقت تنویر مرزا نے ہمیں جواب دیا:' ان سوالوں کا جواب نہیں دیا جائے گا۔'

سوال کرنیل سنگھ سے جواب شفقت تنویر مرزا سے ۔ ہم ان کے رشتے کی نوعیت نہ سمجھ سکے، پھر اجلاس میں جواب دیا جائے گا'۔' اور نہیں دیا جائے گا ' کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ مزدور کسان پارٹی کے کارکنوں نے آستینیں چڑھالیں:' ڈاکٹر کرنیل سنگھ جواب نہیں دیں گے '۔"7

رفیق ڈوگر کے حقیقت پسندانہ اور زمینی حقائق پر مبنی سوالات کا جواب نہ دینا اہل پاکستان کے ادبی حلقے کی جانبداری کا ثبوت ہے۔ رفیق ڈوگر نے ترقی پسندوں کو نیا نام مزدور کسان پارٹی دیا ہے۔ اب ہندو ذہنیت کا ایک اور سیاسی اور فکری گھپلا ملاحظہ فرمائیں:

"پنجابی میں ہندی الفاظ کی تھوک مداخلت کا سبب بھارت کی لسانی پالیسی ہے۔ وفاقی حکومت علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے زبر دست کوشش کر رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر سال بھاری امداد دی جاتی ہے۔ بس ذرا اس رقم کے ساتھ ہندی الفاظ کی ایک فہرست بھی امداد میں بھیج دی جاتی ہے جو ہر صورت میں رقم ختم ہونے تک علاقائی زبان میں داخل کرنا ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے بھارت کے ہر صوبے میں یہ لسانی جدوجہد جاری ہے۔ عنقریب زبانیں مکمل طور پر راشٹریہ سیوک سنگھ ہو جائیں گی ۔ ہندو، ہندی اور ہندوستان کی منزل آسان ہو جائے گی ۔"8

اب لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں مصنف ڈاکٹر کرنیل سنگھ کے منہ سے ہندوستان میں ملاقات کے دوران کہلواتا ہے ۔ اس کے علاؤہ ہجرت سے منسلک ایک سیاسی واقعی کو مصنف رومانوی انداز میں یوں پیش کرتا ہے :

"پاس والی کھڑکی کے سامنے کھڑا بھارتی شہری اتنی رات گئے پاکستانی زائر سے پرانے تعلقات پر روشنی ڈال رہا تھا ۔ یہ تو جی سیاست کی دیواریں ہیں، ورنہ ہم سب ایک ہیں ۔ ہمارے آباؤ اجداد صدیوں اکٹھے رہے۔ یہ دیواریں زیادہ عرصے تک ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں رکھ سکتیں۔

'بالکل نہیں جی۔ میں اس شہر میں اپنے عزیزوں کو جو پندرہ لاشیں چھوڑ گیا تھا انھیں واپس لینے کے لیے مجھے یہ دیواریں پھلانگنا پڑیں گی" دوستی اور خوشحالی کا پیامبر اس زائر کا جواب سن کر دوسری کھڑکی کی طرف چلا گیا"9

یہ جواب دینے والا زائر رفیق ڈوگر کے علاؤہ کون ہو سکتا ہے ۔ ایک خوبی جو رفیق ڈوگر صاحب کو اپنے ہم عصر لکھنے والوں سے جدا کرتی ہے وہ ان کا سماجی و عمرانی شعور ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں منقسم ہر واقعے کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے کر اسے حقائق کے ساتھ منسلک کر کے بیان کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ سفرنامہ ہمیں تاثیر ، تاریخی شعور ، حساسیت، منظر نگاری کے مرقع اور زوال کا احساس فراہم کرتا ہے ۔ اس سفر نامے کو پڑھ کے ہمیں ہندو ذہنیت جو کہ مسلمانوں کے حوالے سے متشدد ہے کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اور مسلمان ہندوستان میں کس حالت میں جی رہے ہیں۔ ان کے مالی حالت کیا ان کی تعلیمی حالت کیا ہے یہ سفرنامہ ان چیزوں کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں حالت اور پسماندگی دیکھ کر مصنف کو ابوالکلام آزاد اور ہر مخالفین پاکستان پر غصہ آتا ہے ۔ وہ ان کا اچھی طرح تاریخی اور فکری معائنہ کرتا ہے ۔ اور ان کی بیماریوں کی تشخیص کرکے آگے گزر جاتا ہے ۔ خصوصاً ایک ہندوستانی مسلمان سے مل کر انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ سکالرشپ زیادہ تر ہندو لڑکوں اور مسلمان لڑکیوں کو دی جاتی ہے ۔ اور ہندوستانی مسلمان ماں باپ بیٹیوں کو ایک مسلہ سمجھنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے اسکی بڑی وجہ پسند کی شادی ، مسلمانوں میں فحاشی اور آزاد خیالی کا فروغ تھا ۔ مسلمان اگر احتجاج کریں تو انہیں پاکستان کا ایجنٹ کہہ کر چپ کروا دیا جاتا ہے ۔ غرض دو گونہ بلا است بر جان مجنون :

"تعلیمی اداروں میں مسلمان طلبہ کو تو یہ بتایا اور سمجھایا جاتا ہے کہ تمام بھارتی ، ہندو مسلم ایک قوم ہیں ۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیتے وقت دو قومی نظریہ پر عمل کیا جاتا ہے اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ مسلمان طلبہ کی بجائے مسلمان طالبات کو وظائف دیئے جائیں۔ طلبہ پیچھے طالبات آگے۔ بیرونی وظائف میں بھی یہی اصول برتا جاتا ہے۔ ہندو طلبا کو وظائف دیئے جاتے ہیں اور مسلمان طالبات کو نتیجہ اکثر صورتوں میں قومی تشکیل کی صورت میں نکلتا ہے۔"10

اس کے علاؤہ قلعہ معلیٰ کی سیر کے دوران مصنف کو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ بڑی چابک دستی کے ساتھ مٹا دی گئ ہے اور من گھڑت واقعات کو تاریخ کا نام دے دیا گیا ہے ۔ پروپیگنڈہ کی روداد سنیے:

ایک گائیڈ قلعہ کی تاریخ کے بیان میں اورنگ زیب کی تنگ نظری، مظالم اور تعصب کی داستان غم سناتے ہوئے ایک بار پھر غمگین ہونے لگا تو راجہ ظفر الحق کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا:' تجھے تو شرم آنا چاہیے یہ جھوٹ بولتے ہوئے تم تو مسلمان ہو'

گائیڈ نے کچھ سوچ کر جواب دیا:' ہمیں یہی بتانے کو کہا گیا ہے۔'یہاں سب کو یہی کچھ بنایا جاتا ہے۔'

مسلمانوں کی تاریخ ہندووں اور ان کے ترجمانوں کی زبانی سن سن کر ہم اپنے کو غیر مسلم سمجھنے لگے تھے غیر مسلموں کا نا معلوم کیا حال ہوتا ہو گا۔

ان حماموں میں شہنشاہ داد عیش دیا کرتے تھے ۔

یہاں اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل کرایا ۔

موسیقی کا جنازہ اس مقام سے گزرا تھا ۔ ہر روز ہزاروں ملکی غیر ملکی مسلمان اور غیر مسلم قلعہ دیکھنے آتے ہیں اور اس کی تاریخ سے آگاہ ہو کر جاتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جن کے پاس تاریخ کا اپنا علم ہوتاہے ؟ ہندو مسلمانوں کے آثار سے دوہرے فوائد حاصل کر رہا ہے۔ دولت بھی کماتا ہے اور مسلمانوں کے روشن ماضی کو اپنے دل کے سیاہ آئینوں سے لوگوں کے سامنے پیش کراتا ہے۔"11

اس سفرنامے کا حال پڑھ کر ہم ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی خامی و خوبی سے آگاہ ہوجاتے ہیں ۔ رفیق ڈوگر اسلوب اور واقعات پر بڑے زہن کی طرح چھا جاتا ہے ۔ مجموعی طور پر ہم اسے رومانوی ادیب کہہ سکتے ہیں ۔

حوالہ جات

1۔ رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء، ص: 11

2۔ ایضاً ، ص: 12

3۔ ایضاً ، ص:22

4۔ ایضاً ، ص:29

5۔ ایضاً ، ص:31

6۔ ایضاً ، ص:35

7، ایضاً ، ص:37-38

8۔ ایضاً ، ص: 42

9۔ ایضاً ، ص:47

10۔ ایضاً ، ص:109

11۔ ایضاً ، ص: 125

محاکمہ

کتابیات

کتابیات

1۔انور سدید ، ڈاکٹر ، اردو ادب میں سفرنامہ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور ، 2017ء،

2۔حامد بیگ، مرزا ،ڈاکٹر ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، لاہور :اورینٹ پبلشرز ، 2014ء

3۔رفیق ڈوگر، اے آب رود گنگا ، لاہور :سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء

4۔سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، ادب و فن،لاہور :مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، 1987ء

5۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر،مباحث، دہلی: کتب خانہ نذیریہ ، جلد دوم،1968

6۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر،اردو ادب کی ایک صدی،دہلی:چمن بک ڈپو